ماہنامہ

القاسم

دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

القاسم

شمارہ (۴)
جلد (۲)

مدیر مسئول
وحید الزماں کیرانوی
(فاضل دیوبند)

سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ ۴۰ پیسے

معاون
ابوالحسن بارہ بنکوی
(فاضل دیوبند)

مرتب: سید عبدالرؤف عالی (مظاہری القاسمی)

نومبر سنہ ۱۹۶۱ء — مطابق — جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۸۱ھ

35000

المیہ

ابھی پچھلے دنوں دارالعلوم کے ایک قابل اور ہونہار استاذ مولانا سید حسن صاحبؒ حرکتِ قلب بند ہونے پر انتقال فرماگئے ، اناللہ وانا الیہ راجعون -

مولانا موصوف اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر دارالعلوم میں ہر دلعزیز تھے ۔ ان کی وفات ایک غیر متوقع حادثہ ہے جس سے دارالعلوم کا ہر فرد متاثر ہے ۔ مولانا موصوف کے انتقال سے دارالعلوم میں ایک ایسے لائق استاد کی جگہ خالی ہوگئی جس کو پُر کرنے کے لئے کوئی دوسرا استاد بڑی دقتِ نظر سے تلاش کرنا پڑے گا ۔ ہمیں مولانا موصوف کی وفاتِ حسرت آیات پر دلی صدمہ ہے ۔ ہم اس موقع پر ان کے اہل وعیال اور اربابِ دارالعلوم کی خدمت میں جذباتِ تعزیت پیش کرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے ۔ (آمین)

(ادارہ تحریر)

ترتیب مضامین

ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر وحید الزماں قاسمی نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند میں چھپوا کر دفتر القاسم دارالفکر دیوبند سے شائع کیا ۔

دارُالعلوم دیوبند اور اس کا مقصدِ تاسیس

انسانی زندگی کا کاروبار بظاہر تہذیب و تمدن اور صنعت و تجارت کے ان مظاہر میں چمکتا ہے جو ہمیں کارخانوں اور فیکٹریوں میں، بازاروں اور منڈیوں میں، دفتروں اور کلبوں میں، ایوانِ نمایندگان اور قصرِ حکومت میں نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ پورا ہنگامۂ حیات اسٹیج کا اک تماشا ہے جس کے محرکات و اسباب تک عام نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ ان کے پیچھے جو ہاتھ کام کرتے ہیں وہی زندگی کو یہ رنگ و روپ دیتے ہیں۔ جو تہذیب و تمدن کی رنگارنگیوں میں دکھائی دیتا ہے۔ — یہ ہاتھ علم و فن کا ہاتھ ہے، فکر و نظر کے تانے بانے ہی سے زندگی کا وہ لباس تیار رہوتا ہے جسے تمدن کہا جاتا ہے۔ یہ تمدن ان تصوّرات کا آفریدہ ہے جو عقل و شعور کی نشو و نما سے تشکیل پاتے ہیں۔ ان تصورات میں علم کا جوہر بھی ہوتا ہے اور فکر کی توانائی بھی۔

پوری انسانی تاریخ کا جائزہ لیجیے تو یہ اندازہ ہوگا کہ افراد کی تنظیم، قوموں کی تعمیر اور تہذیبوں کی تخلیق انہی تصوّرات کی مرہونِ منت ہے جو علم کے جوہر سے زندہ اور فکر کی توانائی سے پایندہ ہے۔ زندگی کے ارتقا کا سرچشمہ ہمیشہ سے علم و فکر ہی رہا ہے۔ ہندوستان کی فلسفیانہ عظمت، مصر و بابل کی فنکارانہ انفرادیت، اور یونان کی ذہانت و عبقریت علم کے خد و خال اور فکر کے آب و رنگ کے علاوہ اور کیا ہے — شاہراہِ زندگی کا یہ طویل سفر طے کرنے کے لئے انسان نے ہمیشہ علم کی انگلی پکڑی ہے اور فکر کے نقشِ قدم کو راہ نما بنایا ہے۔ اس عظیم و عجیب کائنات میں جو اَن دیکھی بھی ہے اور دلچسپ بھی، انسان کی حیرانی و درماندگی کو جب بھی تسکین و اطمینان کا سرمایہ بہم پہنچا وہ انسانی تجسس کے ورثے اور معلوماتِ نو کے مژدے ہی کی شکل میں حاصل ہوا۔

اسلام جو فرد اور جماعت کا سب سے بڑا تعمیر ساز ہے اور جو انسانی زندگی میں انقلاب و تغیر کے بنیادی محرک کی حیثیت سے کارفرما رہا ہے، نہ علم سے نگاہیں پھیر سکتا تھا اور نہ فکر کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ اسلام اپنی تاریخ کے اعتبار سے شروع سے آج تک زندگی کے اس سفر میں انسان کے ساتھ ساتھ رہا ہے جس کی منزلیں سر کرنے میں ابنِ آدم ہزاروں برس سے مصروف ہے۔ جادۂ حیات کے ہر موڑ پر اسلام نے انسان کو علم و فکر کی دولت عطا کی ہے۔ جہاں کہیں انسان نے خوش دلی کے ساتھ اسلام کے اس عطیہ کو قبول کر لیا وہیں اس کا سفر اطمینان و سکون کی ساتھ بے خوف و خطر طے ہوا، اور جہاں اس عظیم سرمائے کی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں باقی نہ رہی وہیں سے اس کے قدم بہک گئے۔ اب سے تیرہ سو برس قبل اسلام نے انسان کو فکر و نظر کی جو استعداد

اور علم وفضل کی جو دولت عطا کی ہے وہ اپنے مزاج وقوام کے لحاظ سے اتنی مستحکم ومربوط ہے کہ اسے کوئی بڑے سے بڑا حادثہ بھی متأثر ومضمحل نہیں کر سکتا، اور اپنے نتائج وثمرات کے اعتبار سے اتنی ہمہ گیر ولازوال ہے کہ انسانی زندگی اپنے ارتقار کے آخری نقطے تک اس سے مستفید ومستفیض ہو سکتی ہے اور لیل ونہار کی کوئی گردش بھی اس کی اثر انگیزی وفیض رسانی میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔

اسلام فکر ونظر کی جو راہیں کھولتا ہے اور علم وفضل کے جن دروازوں پر انسان کو لیجا کر کھڑا کرتا ہے وہ ان تمام راہوں سے مختلف ہیں جن تک انسان اپنی ذاتی جہد وسعی سے پہنچ سکتا ہے، وہ دروازے ان تمام ڈیوڑھیوں سے بہت آگے ہیں جن تک انسان کے قدم صرف عقل وخرد کے بل پر پہنچ سکتے ہیں۔

اسی لئے اسلام کی تاریخ انسان کی تاریخ سے زیادہ قدیم، اس سے زیادہ عظیم اور اس سے کہیں زیادہ مستحکم وپائیدار ہے ـــــ اسلام کا مبدر آغاز علم کا نقطۂ اوّلیں ہے۔ وہ علم جس کی حقیقت ابدی، جس کی کیفیت رُوحانی اور جس کی صورت تعمیری ہے۔ یہی وہ علم بے بہا سرمایہ ہے جس کے وارث انبیار علیہم السّلام ہوتے ہیں۔ اس علم کے بث ونشر کے لئے وہی عظیم الشخصیتیں رہنمایانہ فریضہ انجام دے سکتی تھیں جو غور وفکر ونظر کی اعلیٰ ترین استعداد، اخذ واقتباس کی بہترین صلاحیتیں، نطق وبیان کا بے نظیر ملکہ، تعلیم وتبلیغ کا مؤثر ترین سلیقہ، اور اصلاح وتربیت کا معیاری طریقہ رکھتی ہوں۔

علم زندگی کی آب ہے مگر وہ اسلام کا جوہر ہے، علم سے تہذیب روشن ہے مگر وہ اسلام کی بنیاد ہے، علم سے تمدن شاخ در شاخ ہے مگر وہ اسلام کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے، علم سے زندگی اک انجمن ہے مگر وہ شمعِ اسلام کے لئے فانوس ہے ـــــ اسلام اور علم کا تعلق جان وتن کے رشتے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام نے جب علم کے اس دروازے پر دستک دی جس کی نشان دہی صرف خدا کے فرستادہ ہی کر سکتے ہیں تو اسی آن نہ صرف ابدی اور روحانی علوم کا قصر ہزار ستون سامنے آگیا بلکہ فکر ونظر کی ان شمعوں کی روشنی میں بھی اضافہ ہوگیا جنھیں انسان نے صرف اپنی تگ ودو سے جلایا تھا۔ پھر علم کی وہ سوئی ہوئی انجمنیں بھی جاگ اٹھیں جو انسانی تہذیب وتمدن کو آب وتاب بخش سکتی تھیں اور تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں کا ایک سیلِ رواں امنڈ آیا جس کا دھارا اسلام کے علمبرداروں کے قبضہ میں تھا۔ اسلامی علوم نے مسلمانوں کو وہ گداز قلب بخشا جس نے انھیں اقوام عالم کی اخلاقی اور روحانی امامت کے منصب پر پہنچایا۔ اور وہ روشن دماغ دیا جس نے ان میں سیاست ومدنیت اور تہذیب وتمدن کی قیادت کے اوصاف پیدا کئے۔ امامت وقیادت کے یہ جوہری اوصاف ہی کسی خیر امت کے امتیازی خصائص ہیں۔ مسلمان زندگی کے اسٹیج پر ایک خیر امت کی حیثیت میں نمودار ہوئے اور ایک ہزار سال تک انہوں نے جہاں تہذیب وتمدن کی صورت گری ونقش آرائی کی وہاں اخلاق وروحانیت کے خدوخال میں رنگ آمیزی اور دل آویزی کا فریضہ بھی انجام دیا ـــــ یہ ہزار سالہ دور تاریخ کا وہ انوکھا باب ہے جس نے اسلام کو انسانی علوم کا ہراول بنا دیا۔

فکر و نظر کے ہر سانچے نے اسلام کے اثرات کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ وہ ہزار بار بگڑنے کے باوجود اسلامی اثرات کی پرچھائیں سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکا اور علم و فن کا کوئی گوشہ غلط سے غلط راہوں پر اپنے ارتقار سے باوجود اسلامی قدروں کی آمیزش سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکا۔ اس عہد کی تاریخ پر اس دور کی تہذیب اور اس وقت کے تمدن پر اسلامی افکار و نظریات اور اسلامی علوم و فنون کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے ـــ آج آزادی اور جمہوریت کا معاشرتی انصاف اور انسانی مساوات کا، تقسیم دولت اور تعمیر شخصیت کا چرچا ہر فرد اور ہر قوم کی زبان پر ہے، یہ ہی نعرے پارٹیوں کے سلوگن ہیں۔ لیکن اس واشگاف حقیقت کی موجودگی میں یہ کتنا عبرتناک تماشا ہے کہ آج اسلام قیادت کے منصب سے بے بہرہ اور اس کا سر امامت کے تاج سے محروم ہے۔

مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ہمیشہ سے وقت کے دھاروں پر بہتا رہا، اسے نہ قیادت کی محرومی کا غم ہوا نہ امامت سے معزولی کا احساس اس کے سینے میں بھی کبھی ابھرا، اس کے سامنے دل و دماغ کی ان عظیم قوتوں کی اہمیت نہیں آئی جو اجتماعی سربلندی کا سرچشمہ اور قوموں کی سربراہی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ لیکن امت مسلمہ چونکہ اپنے بقار و ارتقار میں تجدید و تاسیس کے متعدد مراحل سے گذر رہی ہے اسلئے ملت کے ان مجددین و مؤسسین نے اسلام کے اس جوہر کو ہمیشہ زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے جو اسلام کو دوام و ثبات کی قوت عطا کرتا ہے۔ اسلام کے ان نامور فرزندوں کی تاریخ عمر بن عبد العزیزؒ جیسے خلیفہ سے شروع ہوتی ہے، اسلامی علوم و فنون کا چراغ انہوں نے اس طرح روشن کیا کہ علم کے ہر بام و در پر سینکڑوں چراغ روشن ہو گئے، علم و فن کی ان اولین محفلوں کے صدر نشینوں میں اگر زہریؒ، مالکؒ، شعبہؒ، ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، ابو سفیان، عبد اللہ بن مبارک، ابو یوسفؒ، محمدؒ، طحاویؒ، بخاریؒ، ترمذیؒ، مسلمؒ جیسی یگانۂ روزگار شخصیتیں نظر آتی ہیں تو انہی کے ساتھ داؤد طائیؒ، فضیل بن عیاضؒ، اور ابراہیم بن ادہمؒ جیسے زہد و تقوی کے سرچشمے بھی دکھائی دیتے ہیں، پھر اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ چراغوں سے چراغ جلے ہیں اور انجمنوں سے انجمنیں سجی ہیں آگے چل کر رازیؒ و غزالیؒ، ابن تیمیہؒ و ابن قیمؒ، عبد القادرؒ و ابن عربیؒ، جنید و بسطامیؒ، ابن ہمامؒ و شعرانیؒ، عینیؒ و سیوطیؒ، عسقلانی و ہیثمیؒ جیسے لعل و جواہر محراب و منبر کی زینت بنے ـــ پھر انہی کے ساتھ ساتھ ابن سینا و فارابی، ابن رشد و ابن حبان، طوسی و شیرازی، کندی و البیرونی، بلاذری و مسعودی، ابن بطوطہ و ابن جبیر خوارزمی و ابن خلدون جیسے کتنے ہی نابغہ آئے ہیں جنہوں نے انسانی ذہن کے لئے غذا فراہم کی ہے ـــ اور علوم و فنون کو آداب زندگی سکھائے ہیں ـــ یہاں ہندوستان میں خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدینؒ بابا فرید گنج شکرؒ، نظام الدین اولیاءؒ، شاہ عبد القدوسؒ، سید سالار مسعود غازیؒ اور خواجہ گیسو درازؒ رحمہم اللہ جیسے کتنے ہی خاصان خدا نے معرفت خداوندی کی راہ دکھلائی ـــ اور ـــ شیخ علی متقیؒ، مجدد الف ثانی رح، شیخ عبد الحق محدث رح، ملا نظام الدین رح شاہ ولی اللہ رح اور شاہ عبد العزیزؒ جیسے منتخب افراد نے ملت کو وہ فکری، علمی، اخلاقی اور تہذیبی سرمایہ بخشا جو امت کی زندگی ....

کے لیے ناگزیر تھا۔ انہوں نے کتاب وسنت کی روشنی میں اک ملی نصب العین کی نشاندہی کی۔ اسی نصب العین کی حرارت تھی جس نے گزشتہ چار سو سال پہلے اجتماعی وسیاسی ادبار وانحطاط کے گہرے میں امت مسلمہ کو فکر وعمل کی استعداد بخشی خصوصیت کے ساتھ شاہ ولی اللہ کی ذات اس آخری دور میں تاریخ ساز شخصیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے عین طوفان کی زد میں بیٹھ کر امت مسلمہ کے لئے فکر کی ایک شاہراہ تیار کی۔ علم کے ان مٹ نقوش قائم کئے اور عمل کے وہ خطوط سوچے جن کو اختیار کرکے قومیں بنتی ہیں، ملک ابھرتے ہیں اور تاریخ بدلتی ہے۔

اسی فکر وعمل کے امتزاج سے سید احمد شہید نے امت مسلمہ کے اک کارواں کی تشکیل کی تھی۔ جس کا ایک حصہ بالاکوٹ میں گم اور صوات وکاغان کی وادیوں میں محصور ہو گیا۔ تو ایک حصہ فتنہ صادق پور کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اور بقیہ افراد ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ لڑکر دیوبند کے اک گوشے میں سمٹ آئے۔ اور اس ہزار سالہ امانت کے متعلق کچھ نئے خطوط پر سوچنے لگے۔ اس بقیۃ السلف کے میر کارواں مولانا محمد قاسم نانوتوی رح تھے۔ مولانا نانوتوی رح نے ایک طرف دیوبند کے مدرسے کو اس نظام فکر کی ترویج واشاعت کا ذریعہ قرار دیا جس پر ۱۸۵۷ء کی ناکامی نے اضمحلال اور شکستگی طاری کردی تھی اور دوسری طرف اپنی تقریروں اور تحریروں سے اسلام کی علمی وفکری قیادت وامامت کو زندہ کرنے کی کوشش کی جو گزشتہ چند صدی سے جاں بلب تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کو سیاسی میدان کی اتنی ضرورت نہیں جتنی علمی وفکری پہنائیاں اسے مطلوب ہیں۔ کہ علم ہی کے ہاتھوں میں زندگی کی زمام ہوتی ہے۔ اسلام کے نزدیک اخلاق وروحانیت کی اہمیت ہر چیز سے زیادہ ہے اس لئے وہ اخلاق وروحانیت کی امامت کا سب سے پہلے طلبگار ہے۔ اس کے بعد تہذیب وتمدن کی تخم ریزی کے لئے قائدانہ صلاحیتیں خود بخود ابھرتی ہیں۔ یہی نظریہ تھا جس کے تحت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رح کا نظام فکر ایک طرف دارالعلوم دیوبند کی شکل میں سامنے آیا اور دوسری طرف ان کی متکلمانہ تحریروں اور تقریروں میں ابھرا۔ ان کے عہد کو پون صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے مگر ان کے افکار کی تازگی، انکی ندرت وجاذبیت اور انکی عظمت وافادیت آج بھی قائم ہے۔ علم وفکر کی تہذیب وتزئین کا یہ سلسلہ حضرت نانوتوی رح کے بعد حالات کی بعض تبدیلیوں کی بنا پر مسلسل رہ سکا نہ مرتب ہو سکا۔ حالانکہ شیخ الہند رح کے الفاظ میں دیوبند محض درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کے لئے قائم نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا ایک خاص نصب العین تھا۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند اک خاص مکتب خیال کا علمبردار بن گیا۔ اس کی اپنی اک امتیازی تاریخ ہے جو صرف اک مدرسہ اور دارالعلوم کی تاریخ نہیں بلکہ اک مخصوص فکر اور ایک مخصوص نصب العین کی تاریخ ہے۔ بعض تاریخی حوادث نے حضرت نانوتوی رح کی اس عملی تجربہ گاہ کو تحریک کے ڈگر سے ہٹا کر صرف تعلیم وتدریس کے دائرہ میں محدود کر دیا ہے، تاہم اب بھی اس درس گاہ کی صد سالہ دینی واصلاحی خدمات، اخلاقی وروحانی ثمرات اور سماجی وتہذیبی اثرات برصغیر ہند وپاک میں ممتاز ومنفرد ہیں۔

اب کہ دارالعلوم پہلی صدی کے آخری سرے پر کھڑا ہے اور عمر عزیز کی دسویں دہائی بھی تیزی کے ساتھ گزر جانا چاہتی ہے۔ اس کاروانِ قاسمی کے سرد وگرم چشیدہ افراد ایک ایک کرکے اٹھ چکے ہیں۔ گنی چنی چند ہستیاں

جھلملاتے ہوئے چراغ کی طرح بزم حیات میں ابھی کچھ لو دے رہی ہیں، ضرورت ہے کہ افکار قاسمی کی لو مقاصدِ قاسمی کی روشنی میں اس انداز سے ہو کہ وقت کے کان اس کو توجہ کے ساتھ سن سکیں اور زمانہ ادھر سے اپنی نگاہیں نہ پھیر سکے۔

دارالعلوم اک درسگاہ سے کہیں زیادہ حیثیت رکھتا ہے وہ اسلام کے ان عظیم فرزندوں کی امانت ہے جن کا قافلہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ترتیب دیا تھا اور اس شاہراہ کا مسافر ہے جو شاہ ولی اللہؒ نے اگلوں کے لئے بنائی تھی اسے آج کے دور میں قیادت و امامت کے اس تصور کی آماجگاہ بننا چاہئے جو اسلام کی اپنی ذاتی خصوصیت ہے۔ دیوبند مجدد الف ثانی کے علوم کا وارث اور ولی اللہی افکار کا تجربہ ہے، وہ علم و عمل کی اک ایسی تجربہ گاہ ہے جو اپنے نظریات سے اپنے کردار سے اور اپنے ظاہر و باطن سے پیشوائی و رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔

ابھی موقع ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے علوم پر کام کرنے کے لئے فاضل اہل قلم کی اک کھیپ تیار کی جا سکے۔ جو مستقبل میں نہ صرف دارالعلوم کو اس سانچے میں ڈھال دے جو حضرت نانوتویؒ کا اصل منشا تھا۔ بلکہ اس سے ملت اسلامیہ کو فکر و نظر اور علم و عمل کی بھرپور اور ہمہ گیر روشنی اس طرح ملتی رہے کہ کوئی بھی قوت ملت کو استفاضہ اور دارالعلوم کو فیض رسانی سے محروم نہ کر سکے اور دارالعلوم کی دوسری صدی کا آغاز اس طرح ہو کہ دارالعلوم ملک میں علم کی قیادت کا جگمگاتا ہوا مینار ثابت ہو۔ اس عظیم منصوبے کی یاددہانی ہمارا فرض تھا، اس فرض کی تکمیل کے سلسلے میں ہمارا روئے سخن جس طرف ہے وہاں کے لئے یہ بات نئی نہیں ہے کہ پرانی محفل اجڑ رہی ہے نئی محفل کی بساط بچھانے کے لئے ان چراغوں سے روشنی لینے کی ابھی کچھ مہلت باقی ہے جن کے شعلوں میں رات بھر پھول برسانے کے بعد صبح دم چنگاریاں رہ جاتی ہیں۔ ابھی یہ چنگاریاں بھی حرارت وحدت حاصل کرنے کے لئے بہت ہیں۔ پر وقت کا مسافر ایک قدم اور آگے بڑھ جائے گا تو یہ محفل چراغاں سونی نظر آئے گی۔ اور نئے دور کو حضرت نانوتویؒ کے توانا افکار کی روشنی میں اسلام کا پیغام پہنچانے کا فرض باقی رہ جائے گا۔

تصحیح

اکتوبر کے شمارے میں درج ذیل سطور میں حسب ذیل تصحیح کر لیجائے

ص۳۵ سطر۹ "امت مسلمہ کا ثلث سے زائد حصہ" . ص۳۶ سطر۱۲ "مدحت یا منقبت کا لہجہ" . ص۳۶ سطر۱۵ "بعض جگہ تو یہ محسوس ہوتا ہے" . ص۳۹ سطر۱ "اَلصَّلٰوۃُ وَاجِبَۃٌ" ص۳۹ سطر۲۲ مذکر اور مؤنث اور اسی طرح واحد و جمع"

پاکستان میں

رقم جمع کرانے کا پتہ :۔ محمد زاہد صاحب ۔ زاہد پریس ۔ قلعہ روڈ ۔ حیدر آباد سندھ۔

نوٹ : پاکستانی حضرات اس پتے پر سالانہ پانچ روپے بھیجکر رسید منی آرڈر دفتر القاسم دیوبند کو روانہ کردیں ۔

مولانا عبد الغفار حسن صاحب

اختلافِ امّت

اور

سنّتِ رسول

کچھ عرصہ سے ایک ایسا گروہ میدانِ عمل میں مصروفِ کار ہے جس نے سنت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں اور شبہات پھیلا رکھے ہیں۔ یہ حضرات سادہ لوح اور بے خبر عوام کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے سب سے بڑا حربہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ فقہی اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سنت ہی دراصل سرچشمۂ اختلاف ہے کہ جس کی بنا پر بے شمار فرقے بنے اور امتِ مسلمہ کئی ٹولیوں میں منقسم ہو گئی۔ اور اختلاف سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ سنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا جائے۔ اس پر بس نہیں بلکہ اس گروہ کی طرف سے سنت کے قیمتی ذخیرے کو "عجمی سازش" کا نام دیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ گروہ سنت کا دامن چھوڑ کر صرف قرآن سے وابستہ ہونے کا دلفریب دعویٰ کرتے ہوئے اپنے خود ساختہ افکار کو امت میں پھیلانا چاہتا ہے۔

گو آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے بھی اس قسم کی آواز اٹھی تھی لیکن اس دور میں یہ تحریک نہایت سائنٹیفک لبادہ اوڑھ کر میدان میں آئی ہے۔ اس وقت مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت حسب ذیل چار نکات تک ہی گفتگو محدود رہے گی۔

سنت باعثِ اختلاف؟ اس گروہ کی طرف سے یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ سنت اب تک امتِ مسلمہ میں تفریق و اختلاف کے بیج بوتی چلی آئی ہے۔ آیئے تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے دیکھیں کہ کیا قرآن کریم سے غلط استدلال کرتے ہوئے قرآن کریم ہی کو مرجع اختلاف نہیں بنایا گیا اور کیا قرآن کریم سے غلط دعاوی اور باطل مزعومات ثابت کرنے کے لئے حجت بازی نہیں کی گئی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو منکرینِ سنت قرآن مجید کے بارے میں کیا رویہ اختیار کریں گے۔ اس گزارش کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن کی بنا پر اختلاف پیدا ہوا۔ بلکہ یہ تو لوگوں کا اپنا قصور فہم تھا کہ انہوں نے قرآن مجید کو اختلافات کا سرچشمہ بنا دیا۔ پھر غور و فکر اور طریق اجتہاد میں اختلاف کی بنا پر ایک سے زیادہ آراء امت کے سامنے آئیں۔

حدیث کی تاریخی حیثیت (۲) منکرینِ سنت اگرچہ حدیث کو دینی حیثیت نہیں دیتے لیکن تاریخی حیثیت سے

ان کو بھی انکار نہیں ہے۔ یہاں اس تاریخ سے چند واقعات بیان کرتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد کئی ایسے بڑے بڑے اختلافات سامنے آئے جن کی بنا پر امت میں شدید انتشار کا امکان تھا لیکن اس وقت حدیث نبوی ہی وہ واحد قوت تھی جس نے آن واحد میں یہ تمام اختلافات ختم کر دیئے اور امت کا شیرازہ بکھرنے سے بچ گیا۔

انکارِ حدیث سے اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی ہے

(۳) منکرینِ سنت حدیث کو سرچشمۂ اختلاف گردانتے ہیں لیکن ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کیا یہ حضرات حدیث کا دامن چھوڑ کر خود اختلافات کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ یا ان میں اور زیادہ اختلاف پیدا ہوا۔ اور امت کا شیرازہ اور زیادہ بکھر گیا۔

(۴) گو سنت کی بناء پر فقہی مسائل اور جزئیات میں اختلاف بڑھ کر دو رِ انحطاط میں شدت اختیار کر گیا لیکن تمام ائمہ کرام کے درمیان بڑی رواداری اور محبت تھی۔ آپس میں اختلاف کے باوجود ان کے درمیان نہایت گہرے دوستانہ روابط قائم تھے اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا قطعاً ناگوار محسوس نہ کرتے تھے تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں اور نظائر موجود ہیں۔

اب ان چاروں نکات سے متعلق تفصیل ترتیب وار بیان کی جاتی ہے۔

جہاں تک پہلے عنوان کا تعلق ہے ہمیں تاریخ میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے افراد اپنے مفاد کی خاطر قرآن کریم کو نشانہ اختلافات بناتے رہے ہیں۔

قرآن اور اختلافِ امت

اسلامی تاریخ میں سب سے پہلا اختلاف گروہی شکل میں خوارج کی طرف سے نظر آتا ہے جو حامیانِ علیؓ اور معاونین معاویہؓ کے خلاف عملاً میدان میں نکل آیا تھا۔ ان کا اختلاف کسی حدیث یا فرمانِ نبوی کی بناء پر نہ تھا بلکہ انہوں نے سب سے پہلے قرآن کی یہ آیت ہی پیش کی۔

ان الحکم الا للہ۔ حاکمیت صرف خدا ہی کے لئے ہے۔

وہ اس آیت کی بناء پر حضرت علیؓ کو مورد الزام ٹھہراتے تھے کہ انہوں نے انسانوں کی ثالثی قبول کیوں کی۔

ایک مثال اور لیجئے۔ رحلتِ نبویؐ کے فوراً ہی بعد مسیلمہ کذاب کا فتنہ سامنے آیا۔ مسیلمہ کے ماننے والوں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے مسیلمہ کذاب پر ایمان لاتے ہوئے نعرہ بلند کیا تھا۔

کفانا ھدایۃ القرآن۔ ہمیں قرآن کی ہدایت کافی ہے۔

ان کا موقف یہ تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ان کی زندگی تک محدود تھی۔ اور آپ کی رحلت کے بعد آپ کی اطاعت فرض نہیں رہی۔ موجودہ منکرینِ سنت کی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ آنحضورؐ

اپنی زندگی میں مرکز ملت کی حیثیت رکھتے تھے لیکن آپ کی وفات کے بعد ہر دور میں ایک نیا مرکز ملت ہوگا۔ جو عصری تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی قوانین و احکام میں تبدیلیاں کرنے کا مجاز ہوگا۔

واضح رہے کہ مسیلمہ کذاب کے حامی گروہ نے اپنے موقف کی تائید میں کسی حدیث کو پیش نہیں کیا تھا، بلکہ انہوں نے مسیلمہ کی رسالت پر قرآن ہی سے استدلال کیا تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں ہے:

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا

ہم نے تمہاری طرف اسی طرح رسول بھیجا ہے جس طرح کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا

فرعون کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام بھیجے گئے تھے لیکن ان کی ساتھ ان کی اعانت کے لئے حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی بھیجا گیا تھا۔ اسی آیت کریمہ سے کما (جس طرح) کا لفظ لاکر پیغمبر علیہ السلام کی بعثت کو حضرت موسیٰ کی بعثت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس لئے حضرت موسیٰ کے معاون کی طرح آنحضورؐ کا بھی کوئی معاون ہونا چاہیئے۔ اور وہ معاون مسیلمہ ہے۔

یہ تھا ان کا غلط استدلال جس کے لئے اس آیت کریمہ کو ہدف بنایا گیا۔

(تفصیل کے ساتھ ملاحظہ ہو تاریخ ابن خلدون اور الملل والنحل از شہرستانی)۔

ہم آج کے دور میں بھی منکرین سنت کے موجودہ گروہ کی طرف سے یہی آوازیں سن رہے ہیں کہ اطاعت کا لفظ صرف زندہ شخص ہی کے لئے بولا جاسکتا ہے، قادیانیت کو ہی ملاحظہ کیجئے۔ ان کے تمام استدلالات کا مرجع و منبع سب سے پہلے قرآن کریم ہی ہے۔ گو ان استدلالات کا غلط ہونا ایک الگ بات ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا انہوں نے سب سے پہلے قرآن کریم ہی کو اپنا مرکز استدلال نہیں بنایا؟۔ اموی اور عباسی دور میں مختلف فرقے جیسے کرامیہ، معطلہ، جہمیہ، معتزلہ وغیرہ سب سے پہلے قرآن کریم ہی کو اپنے عقائد کی بنیاد بناتے تھے بمقصد یہ ہے کہ اگر کسی ماخذ کی تفصیلات سمجھنے میں اختلاف پیدا ہو تو یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ اسے بالکل ہی چھوڑ دیا جائے۔

سنت اور اختلاف امت اب ہم دوسرے عنوان کو لیتے ہیں کہ سنت ہی وہ واحد قوت تھی جس نے بڑے بڑے اختلافات دور کرنے میں مدد دی ہے آنحضورؐ کی رحلت کے معاً بعد یہ زبردست اختلاف سامنے آیا کہ منصب خلافت کس کو سونپا جائے، انصار اس کے زیادہ حقدار ہیں یا مہاجرین۔ انصار کا اعلان تھا کہ:-

منا امیر ومنکم امیر

ایک امیر ہم میں سے ہو ایک تم میں سے

یہ اختلاف ظاہر ہے کہ بڑے خطرناک اور دور رس نتائج کا حامل تھا اور اس اختلاف کا باقی رہنا امت مسلمہ کے لئے ایک بڑے فتنہ کا سبب بنتا۔ اس نازک موقع پر حضرت ابوبکرؓ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع میں یہ

حدیث پیش کرتے ہیں ۔

الائمۃ من قریش ۔ امام قریش میں سے ہوں گے ۔

بعض روایات میں اتنا اضافہ ملتا ہے ۔

فلما سمعوا الحدیث اذعنوا لہٗ ورجعوا لہٗ ورجعوا عن قولھم

یعنی جب انصار نے یہ حدیث سنی تو سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا دعویٰ انھوں نے واپس لے لیا

(فتح الباری شرح صحیح بخاری مطبع انصاری پ۱۴ ص۳۶۵ تاریخ الامت ج ۲ ص۱۳ از حافظ محمد اسلم جیراجپوری)۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قریش اسلام لانے میں سبقت رکھتے ہیں اور دوسرے تمام عرب میں جو اثر ورسوخ اور رعب ودبدبہ ان کا ہے وہ اور کسی قبیلے یا گروہ کو حاصل نہیں ہے ۔ اس لئے ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی امامت کا کامیاب رہنا انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہے ۔ اس بات کو دوسری حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے ۔

خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا (صحیح مسلم و مشکوٰۃ ص۳۲)

جو جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر شمار ہوں گے بشرطیکہ ان کو دین کا فہم اور تفقہ حاصل ہو ۔

آنحضور کا یہ نہایت حکیمانہ ارشاد تھا جس سے ایک بڑا فتنہ بڑی آسانی سے دب گیا ۔ ایک دوسری مثال لیجیئے ۔

جس طرح کہ عام اشخاص کا ورثہ ان کی موت کے بعد ان کے اعزہ واقارب میں تقسیم ہوتا ہے اسی طرح آنحضورؐ کی رحلت کے بعد حضرت فاطمہؓ کا خیال تھا ۔ آپ کا ورثہ بھی وارثین میں تقسیم ہو ۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ جن پر منکرِ سنت ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے آگے بڑھے اور یہ حدیث پیش کی ۔

لا نورث ما ترکنا صدقۃ :۔ ہمارا ورثہ تقسیم نہیں ہوتا ۔ ہم جو کچھ چھوڑیں ۔ صدقہ ہے ۔

(بخاری ص۲۶، مسلم ص۹۳ ۔ مشکوٰۃ ص۵۵)

چنانچہ یہ واضح ہوتے ہی کہ نبی کا ورثہ اولاد کو نہیں ملتا ۔ بلکہ تمام امت کا ہوتا ہے ۔ حضرت فاطمہؓ مطمئن ہوگئیں ۔ (بیہقی ۶ ص۳۰) ۔

اس وقت یہ اختلاف بھی پیدا ہوا کہ آنحضورؐ کی نعش مبارک کو کہاں دفن کیا جائے ۔ بعض حضرات کا خیال تھا کہ آپ کو اپنے آبائی وطن مکہ لے جا کر سپردِ خاک کیا جائے ۔ اور بعض کہتے تھے کہ نہیں مدینہ ہی کو یہ سعادت ملنی چاہیئے ۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ بیت المقدس میں لے جایا جائے کیونکہ وہاں دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی مدفون ہیں ۔ اس بات پر اختلاف بڑھا لیکن حضرت ابوبکرؓ نے حدیث پیش کر کے یہ مشکل حل کر دی ۔ حدیث یہ تھی ۔

انہ لم یدفن نبی قط الا حیث یقبض : نبی وہیں دفنایا جاتا ہے جہاں کہ اس کی روح قبض ہوتی ہے (ترمذی) ۔ چنانچہ جس حجرۂ مبارکہ میں آپ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے تھے وہیں دفن کئے گئے ۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۵ ص۲۶۶) [بقیہ ص۱۹ پر]

الطاف القدس

قسط نمبر ۳

ترجمہ از مولانا محمد کاشف الہاشمی صاحب

لطائف کا ہے سے بنتے ہیں

جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ روح کیا ہے اس وقت تک لطائف کی وضاحت سخت تشنہ ہے، ادھر روح کا مسئلہ علم حقائق سے تعلق رکھتا ہے، علم سلوک سے اس کو نسبت نہیں، یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ شارع علیہ السلام نے علم حقائق کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں فرمائی، وہاں جو کچھ ہے علم سلوک کی تہذیب کا معاملہ ہے۔ اور بس۔ وہاں جو کچھ ہے بس یہ کہ ایسے علوم کو جن کو عرب و عجم سبھی جانتے ہیں ان کے متعلق کچھ مجملاً ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ان میں غور و خوض اور تفصیلات سے سختی سے روکا گیا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا طریق یہی ہوتا ہے، جہاں تک انسانی دسترس کا تعلق ہے وہ ان علوم کو ضرور پالیتی ہے مگر ان کا اظہار قطعاً غیر مناسب ہے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

ہمارے لئے بھی اولیٰ سکوت ہی ہے، مگر چونکہ اس بارے میں صوفیہ کا اختلاف حد سے زیادہ بڑھ چکا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اختلاف ان کی طبیعت کا خاصہ بن گیا ہے۔ چونکہ یہ سارا جھگڑا علم لطائف ہی کی بنا پر ہے اور لطائف کا معاملہ روح پر متعلق ہے اس لئے ضرورۃً اس کے متعلق کچھ کہنا ناگزیر ہے۔

روح کیا ہے؟

روح وہ قوت ہے کہ جب جسم سے پیوستہ ہوتی ہے تو جسم زندہ ہو جاتا ہے اور الگ ہوتی ہے تو مردہ ہو جاتا ہے۔ تم نے بارہا دیکھا ہو گا کہ جب گوبر سڑ جاتا ہے تو اس میں ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے، اس میں احساس و حرکت کے تمام آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس احساس و حرکت کا سب سے پہلا سبب روح ہے۔ انسان کو دیکھو جب اسے موت آتی ہے تو احساس و حرکت ختم ہو جاتی ہے پھر اس میں اور ایک جماد میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ صاف بات ہے کہ جس قوت سے محرومی کے بعد انسان پر عالم طاری ہوتا ہے وہی تو روح ہے! اتنی بات معلوم ہو جانے کے بعد آگے قدم بڑھاؤ اور سوچو کہ روح کے اجزاء کیا ہیں؟ سمجھ لو کہ روح تین اجزاء سے مرکب ہے۔

روح کا پہلا جزو عناصر کے ہضم ہو جانے کے بعد جو ایک لطیف بخار پیدا ہوتا ہے اس کی ہوا روح کا پہلا جز دیا عنصر ہے۔ انسان کی غذا، بڑھوتری اور ادراک کا کاروبار اسی سے وابستہ ہے۔ اس کو تین اسماء سے موسوم کیا جاتا ہے، نسمہ، روحِ طبعی اور بدنِ ہوائی۔ اس کا اثر اور پیوستگی، گوشت پوست میں اس طرح ہوتی ہے جیسے دہکتے ہوئے کوئلے میں آگ یا گلاب کے پھول میں پانی۔ روح کا بھی جزو بدن سے رابطہ استوار رکھتا ہے۔ اسی کی مفارقت کے بعد بدن، بدن نہیں رہتا۔ چنانچہ بدن سے جدا ہونے کے بعد روح بھی اک گونہ تکلیف محسوس کرتی ہے ــــــ اس ہوا یا لطیف بخار کا اصل مرکز قلب، دماغ اور جگر ہے۔ جب خون میں جوش پیدا ہوتا ہے تو یہ بخار سب سے پہلے قلب میں زندگی پاتا ہے، طبی معاملات بھی اسی سے وابستہ ہیں۔ غلظت، رقت، صفائی، کدورت، کمی بیشی، یہ سب حالتیں اطباء کے یہاں معروف ہیں۔ جب اس ہوا کا تعلق قلب سے ختم ہو جاتا ہے تو موت سے تعبیر کرتے ہیں، موت آنے کے بعد بدن کا معاملہ بالکل اس درخت کی طرح ہو جاتا ہے جس کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جڑ کٹنے کے بعد غذا نہیں ملتی جس کے نتیجے میں تحلیل ہونے والے اجزا کا بدل ناپید ہو جاتا ہے۔ پھر بھی لکڑی کو پھٹنے، گلنے، سڑنے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح اس بخار اور نفسِ ناطقہ کے معاملہ کو سمجھ لو۔ یہ معاملہ مدت کے بعد بھی بدستور رہتا ہے۔ پھر بخار لطیف یک لخت بدن سے الگ نہیں ہو جاتا بلکہ آہستہ آہستہ اس کے اجزاء پراگندہ ہوتے جاتے ہیں۔

روح کا دوسرا جزو روح کا دوسرا جزو نفسِ ناطقہ ہے۔ اس کے متعلق بھی کچھ سن لیجئے۔ جب ہم کوئی بیج زمین میں بوتے ہیں اور پانی، ہوا، مٹی کے لطیف اجزاء اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ تو بیج کی ایک پوشیدہ الٰہی قوت ان اجزاء کو اندر کی طرف جذب کرتی ہے، اور ایک خاص صورت میں ڈھالنے کا کام انجام دیتی ہے۔ اسی سے اس کا جسم پھیلتا اور بڑھتا ہے۔ پھر ایک خاص نظام کے ماتحت پتیاں اور شاخیں نمودار ہو کر پھول اور پھل لاتی ہیں۔ پھر جب ضعف طاری ہوتا ہے تو پودا نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ ہر بیج، ہر پودا ایک خاص اور عجیب و غریب زندگی سے آشنا ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر لامحالہ ایک ایسی قوت اور نفس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جو ہر پودے کو ایک خاص نہج پر لے چلتی ہے جس نے ان تمام قوتوں کو خود میں سمو کر ایک خاص شکل دی ہے۔ اب انسان کو دیکھو، اس کی ولادت کے بارے میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو مرکباتِ ارضیہ کی عفونت ایک خاص مدت کے بعد اپنی شکل میں آجاتی ہے۔ یا یہ کہ جب منی اور خونِ حیض رحمِ مادر میں جمع ہو جاتے ہیں تو رحم ہی ان کو زندگی کی ایک خاص نشو ونما عطا کرتا ہے، تا آنکہ قلب، دماغ اور جگر کا سانچہ تیار ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں روحِ ہوائی کا نزول ہوتا ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں یہ ماننا پڑے گا کہ اجزاء کی اپنی خاص شکل فنا ہو کر ایک اور ہی صورت رونما ہو جاتی ہے جس کے تعلق سے احکام بھی بالکل الگ مرتب ہوتے ہیں۔ اسی کو نفسِ حیوانی کہتے ہیں۔ انسان میں آ کر یہ قوت نفسِ ناطقہ کہلاتی ہے اسی سے انسان کا پورا نظامِ جسمانی، فکر و تدبر، حواسِ خمسہ کا ظہور وابستہ ہے۔ اس نفسِ ناطقہ کو خصوصاً اور دیگر

نفوس کو نفسِ کلیہ کی امواج سمجھو۔ ذرا نفسِ کلی کا معاملہ بھی سمجھتے چلو! اربابِ وجدان کا فیصلہ ہے کہ اس پورے عالم میں ایک قوت یا ایک نفسِ کلی کارفرما ہے، آسمان کی بلندیوں سے لے کر زمین کی پستیوں تک کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کے اثر سے ہوتا ہے۔ اسی کو نفسِ کلیہ کہتے ہیں۔ پھر چونکہ خاص افعال و آثار کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے اس لئے اس کو طبیعت کلیہ بھی کہتے ہیں۔ پھر جو نظام اس نفس کے تقاضوں سے برپا ہوتا ہے اس کو مصلحتِ کلیہ کہتے ہیں۔ افلاک کی قوتیں ہوں یا عناصر کا کاروبار، نفوسِ نبات کا معاملہ ہو یا نفوسِ حیوان کا، ان کو اس طرح سمجھو کہ جس طرح ایک ہی بدن میں مختلف اعضاء اور قویٰ ہوتے ہیں۔ ان سب کی تدبیر کا بار اسی پر ہوتا ہے۔ وہی ایک قوت ہے جو ہر مخلوق کے تمام اطوار و ادوار میں کبھی ظہور بن کر اور کبھی خفا بن کر جلوے دکھلاتی ہے، پانی جب ہوا بن جاتا ہے اور ہوا جب پانی بن جاتی ہے تو یہی نفسِ کلیہ ہے کہ یہاں چھپ گیا، وہاں ظاہر ہو گیا۔ اب یہ سمجھ لینا بہت آسان ہو گیا کہ جو قوت انسان میں نفسِ ناطقہ کے عنوان سے مرکوز ہے وہ دراصل نفسِ کلیہ ہی ہے۔ یا یوں سمجھو کہ ہیولیٰ میں جب ایک خاص استعداد پیدا ہو جاتی ہے تو اس کو نفسِ کلیہ نفسِ ناطقہ کے واسطہ سے اپنا لیتا ہے۔ اس کے برعکس یہ صورت ہے جب نفسِ ناطقہ میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے تو انسانی وجود فنا ہو جاتا ہے۔ اب اس کا اثر نفسِ کلیہ پر مرتب ہوتا ہے۔

روح کا تیسرا جزو

روح کا تیسرا جزو ملکوت ہے۔ یہ ملکوت کیا ہے؟ اس کو بھی سمجھ لو، کہ جب اس عالم میں کوئی چیز ہونے والی ہوتی ہے تو سب سے پہلے نفسِ کلیہ سے متعلق قوتیں اس کا تخیل یا صورت لئے لئے پھرتی ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح انسان کوئی کام یا کارنامہ انجام دینے سے قبل ذہن میں اس کی تصویر بٹھاتا ہے۔ اس طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ چار عناصر سے مل کر بننے والا انسانی نفس وہی تو ہے جسے اس سے پہلے نفسِ کلیہ متعلق قوتوں کا قافلہ سر پر لئے پھرتا تھا۔ یا یوں کہو کہ ان قوتوں کے پیچ و خم میں جو صورت گم تھی وہی تو ہے جو آج صفحۂ ہستی پر نمودار ہوئی ہے۔ اچھا اور آگے چلو! جب خداوند ذوالجلال نے ارادہ فرمایا کہ انسان نامی مخلوق کو پیدا کرے تو اس کی تخلیق سے بہت پہلے ایک مجمل صورت نفسِ کلیہ کے قویٰ کے دامن میں ڈال کر ان کو محافظ قرار دیا۔ پھر اس کے بعد ہزاروں سال بیتنے پر مبدءِ خاص سے ایک فیضِ تازہ اس صورتِ اجمالی سے ہم آغوش ہوا۔ اور یہ ایک ہی صورت لاکھوں صورتوں میں سامنے آتی چلی گئی۔ جیسے تم آفتاب کے سامنے ایک بڑا سا آئینہ رکھ دو، پھر بہت سے چھوٹے چھوٹے آئینے اس بڑے آئینے کے گرد رکھ دو۔ ان سب آئینوں میں اسی ایک آئینے سے آفتاب کا چہرہ نظر آئے گا۔ اب یہ نظر آنے والا چہرہ ہر آئینہ کے لحاظ سے تو مستقل چہرہ ہے مگر اس بڑے آئینہ کے لحاظ سے عکس ہی ہے۔ اسی طرح ہر انسان کی الگ الگ روح کے مسئلے کو سمجھ لو۔ اچھا اور آگے چلو۔ اس فیض کے ہزاروں سال بعد ایک اور فیض اس صورتِ اجمالی سے ہم آغوش ہو۔ اور صورت کے بعض قویٰ کو اپنا نشیمن بنایا، جب روحِ ہوائی انسان کے بدن کو مبارک کی سلامتی دیتی ہے تو نفسِ کلیہ کا ایک پردہ گرتا ہے اور دوسرا اٹھتا ہے۔ (باقی آئندہ)

ازمولانا محمد عبداللہ فاضل دیوبند

مظالم کی صحابہؓ

حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ

جنگ احد کے بعد کفار مبلغین اسلام کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے جاتے تھے کہ ہمارے قبیلے کے لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ انھیں اسلام کی باتیں سکھانے کی ضرورت ہے۔ مگر راستے میں دھوکے سے ان کو شہید کر دیتے تھے۔

حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ بھی بحکم نبوی عقل اور قارہ (دو قبیلوں) کے چند آدمیوں کے ساتھ گئے، تاکہ اسلام کی باتیں سکھائیں۔ آپ دونوں کے علاوہ آٹھ مسلمان اور بھی تھے جو کفار کی دھوکہ دہی سے شہید ہو گئے۔ البتہ حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ کو فروخت کے لئے مکہ لایا گیا۔ حضرت خبیبؓ نے جنگ احد میں ایک کافر کی گردن اڑا دی تھی۔ اس کے بیٹے نے آپ کو خرید لیا تاکہ انھیں باپ کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے کئی روز اپنے مکان میں بھوکا پیاسا رکھا آخر بنو الحارث آپ کو قتل کرنے کے لئے حرم سے باہر لے گئے۔ اور کہا اگر اب بھی محمدؐ کے دین کو چھوڑ دو تو تم رہا کر دیئے جاؤ گے۔ آپ نے فرمایا (واہ یہ بھی کوئی بات ہے) بھلا جب اسلام ہی نہ رہا تو زندگی کس مصرف کی۔ مطلب یہ تھا کہ اسلام کو چھوڑ کر زندہ رہنا بیکار و فضول ہے۔ کفار نے پوچھا اس آخری وقت میں کوئی خواہش ہے تو بتاؤ۔ آپ نے کہا ہاں دو رکعت نماز پڑھنے کو جی چاہتا ہے، کافروں نے اس کی مہلت دے دی۔ آپ نے مختصر نماز ادا کر کے فرمایا میری دلی تمنا تھی کہ نماز دیر تک پڑھتا رہوں مگر خیال آیا کہ دشمن یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ موت کے خوف سے نماز کو طویل کر رہا ہے۔ اس کے بعد آپ کو تماشائیوں کے ہجوم میں صلیب کے نیچے کھڑا کیا گیا۔ اس قتل کے موقع پر آپ نے کچھ اشعار کہے جن سے اسلام کی محبت ٹپکتی ہے اور استقامت دین کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اور جن کو پڑھ کر قاری کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔

لقد جمع الاحزاب حولی والبوا قبائلهم واستجمعوا کل مجمع

لوگوں کا گروہ میرے چاروں طرف (گرداگرد) کھڑا ہے اور انہوں نے بڑے بڑے قبیلوں کو بلایا ہے۔

وکلہم مبدی العداوۃ جاھد　　علی لانی وثاق بمضیع

اور سب کے سب میرے خلاف عداوت اور جوش کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور میں اس قتل گاہ میں پڑا ہوا ہوں۔

وقد جمعوا ابنائھم ونسائھم　　وقربت من جزع طویل ممنع

اور ان قبائل نے اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی بلا رکھا ہے اور مجھے ایک بلند لکڑی یعنی سولی کے پاس لے آئے ہیں۔

وقد خیرونی الکفر والموت دونہ　　وقد ھملت عینائ من غیر مجزع

اور انہوں نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ کفر کو اختیار کرنے پر رہائی ہوسکتی ہے لیکن میں کفر کو ہلکا سمجھتا ہوں مجھے ان کی حماقت آمیز پیش کش پر رونا آتا ہے میری آنکھیں پُرنم ہیں لیکن بے قراری نہیں۔

فلست بمبد للعدو تخشعا　　ولا جزعا انی الی اللہ مرجعی

میں قطعاً دشمنوں کے سامنے عاجزی نہ کروں گا اور نہ جزع فزع کروں گا، مجھ کو علم ہے کہ میں خدا کی طرف جا رہا ہوں۔

ومالی حذار الموت انی لمیت　　ولکن حذاری جحم نار ملفع

مجھے موت کا ڈر نہیں ہے اس لئے کہ موت تو آنی ہے بلکہ میں تو لپیٹ والی آگ کے خون چوسنے سے ڈرتا ہوں۔

الی اللہ اشکو غربتی ثم کربتی　　وما ارصد الاحزاب لی عند مصرعی

میں تو اپنی غربت اور تکلیف کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں اور ان ارادوں کی جو میرے جانے کے بعد یہ لوگ رکھتے ہیں۔

فواللہ ما ارجو اذ امت مسلما　　علی ای جنب کان للہ مصرعی

خدا کی قسم جب میں اسلام پر جان دے رہا ہوں تو میں یہ پرواہ نہیں کرتا کہ راہِ خدا میں کس پہلو پر گرتا اور کیونکر جان دیتا ہوں۔

وذالک فی ذات الالہ وان یشاء　　یبارک علی اوصال شلو ممزّق

یہ جو کچھ ہے خالصاً لوجہ اللہ ہے۔ اگر خدا چاہے تو گوشت کے ہر ٹکڑے کو برکت عطا کرسکتا ہے۔

یہ رجزیہ اشعار پڑھتے رہے اور آخر میں دعا کی اللّٰھم بلغنا رسالۃ رسولک فبلغہ ما یصنع بنا خدایا ہم نے تیرے رسول کے احکام ان لوگوں کو پہنچا دیئے، اب تو اپنے رسول کو ہمارے حال سے باخبر کر دے۔ حضرت خبیبؓ کو اسی حالت میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ دوسرے روز کفار نے آپ کی لاش کی بے حرمتی کرنا چاہی مگر وہ آپ کی لاش کو پا نہ سکے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر

ایک صحابی حضرت خبیبؓ کی لاش لانے کے لئے گئے تھے۔ جب صلیب کی لکڑی پر چڑھکر رسی کاٹی تو لاش زمین پر گری، خدا کی شان کہ زمین نے فوراً شق ہوکر آپ کی لاش کو اپنے اندر چھپالیا۔ اب رہے حضرت زیدؓ، یادر ہے کہ صفوان بن امیہ نے آپ کو قتل کے ارادہ سے خریدا تھا، آپ کی شہادت کے وقت بھی ابوسفیان اور قریش کے معزز سردار تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ ابوسفیان نے بوقت قتل آپ سے کہا، اگر تم چھوٹ جاؤ اور تمہارے بدلے محمدؐ پھنس جائیں (نعوذ باللہ) اور قتل کئے جائیں تو اس کو تم بہتر سمجھوگے، سچ کہو، یہی بات ہے نا۔ یہ سن کر حضرت زیدؓ نہایت برہم ہوکر بولے، کیا کہا تونے! خدا قسم میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ میری جان بچانے کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک میں کانٹا بھی چبھ جائے۔ اس جواب پر آپ کو تلوار سے شہید کر دیا گیا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ شمع رسالت کے پروانوں کی طرف سے محبتِ رسول اور دینِ حق پر استقامت اور ایثار کا کس قدر عظیم الشان مظاہرہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں جان جیسی پیاری چیز کی کوئی پرواہ کئے بغیر اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کر دیا۔

حضرت فروہؓ بن عمرو کی ثابت قدمی

آپ شہر معآن کے قبیلہ بنی جذام کے سردار تھے اور شہر معآن سلطنت روم کے زیر اثر تھا۔ جب یہاں اسلام کی کرن پہنچی اور فروہ بن عمروؓ نے اسلام پر سرِ تسلیم خم کر دیا تو بتقاضائے محبت پیغمبرِ اسلام کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوکر تحائف پیش کر کے اپنی عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ بس اتنی سی بات تھی جسے رومی سلطنت نے افسانہ بنا دیا اور ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا۔ اور گرفتار کر کے قبول اسلام کے جرم میں قید خانے میں ڈال دیا۔ مگر فروہ کو اس گرفتاری کی کوئی پرواہ نہ ہوئی، اگر فکر تھی تو یہ کہ سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کس طرح حاضری دی جائے اور اپنی بیوی سے کیونکر ملاقات کی جائے، اس کا خیال آٹھوں پہر رہنے لگا۔ شب و روز اسی دھن اور اسی تصور میں غرق رہتے، دل کی بے قراری بڑھی تو بحالتِ اسیری قیدخانہ میں یہ اشعار کہے:۔

طرقت سلمٰی موهنا خشحانی — والروم بین الباب والقربان

میں نے نصف شب کو سلمٰی کے دروازہ پر دستک دی جب رومی دروازہ پر تھے اور قریب آچکے تھے

صد الخیال وساءہ مافد رائے — وھممت ان اغفی وقد ابکانی

خیال ادھر متوجہ ہوا اور جو کچھ مشاہدہ کیا نا گوار گزرا اور سونے کا ارادہ کیا مگر اس کے بدلے رونا آیا

لا تکحلن العین بعدی اثمداً — سلمٰی ولا تدن من للانسان

(دیکھو) سلمٰی تم اپنی آنکھوں میں میرے بعد سرمہ مت لگانا اور نہ کسی غیر محرم انسان کے پاس جانا۔

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ ان کے کہنے والے کا دل کس قدر غمگین ہے۔ صحبتِ ماضی کے نقوش ابھرتے ہیں

اور یاد رفتہ جو ابھی تک دل نشیں ہے کس قدر تڑپاتی ہے۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اپنی شریک زندگی (بیوی) کا
کا عاشق زار محض اس لئے قید کیا گیا ہے کہ اس نے اسلام کیوں اختیار کیا۔ اگر یہ اسلام چھوڑ دیں تو قید سے رہا کئے
جا سکتے ہیں مگر انہیں اپنی محبوب بیوی سے جدائی گوارا لیکن ترکِ اسلام کی صورت گوارا نہیں۔
رومی ان اشعار کو سن کر ترس تو کیا کھاتے ان کی اس مضبوطی کو دیکھ کر سولی دینے کا عزم کر لیا۔ انہیں
فلسطین لے جا کر عفری ندی کے کنارے سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اس وقت ان کی زبان سے یہ اشعار سنے گئے

الا ھل اتی سلمیٰ بان خلیلھا   علیٰ ماء عفریٰ فوق احدی الرواحل

سلمیٰ کو بھی پتہ چلا کہ اس کا دوست اب لبِ عفریٰ ایک اونٹنی پر سوار ہے۔

علیٰ ناقۃ لم یلقح الفحل امھا   مشذبۃ اطرافھا بالمناجل

جو حاملہ نہیں ہوئی اور اس کے اعضا پھنسیوں سے جگہ جگہ زخمی ہیں۔

بلغ سراۃ المسلمین باننی   مسلم لربی اعظمی و مقامی

سرداران اسلام کو یہ بات پہنچا دو کہ میری ہڈیاں اور میرا وطن میرے رب کے سپرد ہیں

حضرت عبداللہ بن حذافہؓ

آپ کسی لڑائی میں رومیوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے تھے، آپ کو ایک قیدی کی حیثیت سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ عیسائی تھا۔ وہ
قیدیوں کو بھی عیسائی بنانا چاہتا تھا، اس نے حضرت عبداللہؓ سے بھی کہا، اگر تم نصرانی ہو جاؤ تو اس میں
تمہاری خیر و عافیت ہے ورنہ تانبے کی گرم دیگ (یعنی کھولتے ہوئے تیل) میں ڈال دیئے جاؤ گے۔ آپ نے
کہا کچھ ہو میں اسلام کو چھوڑ کر نصرانی نہیں بن سکتا۔ بادشاہ نے ان کو خوفزدہ اور اسلام سے برگشتہ کرنے کی
دوسری ظالمانہ تدبیر یہ کی کہ مسلمان قیدیوں میں سے ایک قیدی کو طلب کیا اور نصرانی ہونے کے لئے زور
دیا۔ اس اسلام کے سچے پرستار نے صاف انکار کر دیا۔ پھر کیا تھا بادشاہ نے دیگ میں ڈالنے کا حکم دیا چنانچہ
وہ دیگ میں ڈال دیئے گئے۔
عبداللہ بن حذافہؓ کے سامنے یہ دردناک منظر تھا کہ مسلمان بھائی کا گوشت پوست بالکل جل گیا۔ ہڈیاں
الگ ہو کر تیل کے اوپر تیرنے لگیں۔ بادشاہ نے عبداللہ بن حذافہ سے کہا دیکھو تم نصرانی ہو جاؤ ورنہ تمہارا
بھی ایسا ہی انجام ہو گا۔ حضرت عبداللہ نے اس بات کی بالکل پروا کئے بغیر کہ مجھ کو بھی دیگ میں ڈال دیا
جائے گا، نصرانیت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو بھی دیگ میں ڈال دو۔ یہ
سن کر آپ رونے لگے۔ لوگوں نے یہ خیال کیا کہ شاید گھبرا گئے۔ بات بادشاہ تک پہنچائی گئی۔ اس نے اس
امید پر آپ کو طلب کیا کہ شاید نصرانی ہو جائیں گے مگر معاملہ برعکس تھا لہٰذا ہکا بکا رہ گیا۔ حضرت عبداللہ
فرما رہے تھے کہ یہ مت سمجھو کہ میرا رونا ڈر کی وجہ سے ہے بلکہ میں تو اس پر رو رہا ہوں کہ صرف ایک جان
ہے میں تو یہ چاہتا تھا کہ میرے جس قدر بال ہیں اسی قدر جانیں پاتا اور تم ہر جان کے ساتھ اپنے منشا کے

مطابق معاملہ کرتے۔ اس بے باکی اور صداقت پسندی پر بادشاہ بہت متاثر ہوا اور چاہا کہ آپ کو رہا کر دے لیکن یہ قید لگائی کہ میرے سر کا بوسہ لو۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ نے اپنی لڑکی سے شادی کرنے کا وعدہ کیا۔ آپ نے اس کو بھی رد کر دیا۔ بادشاہ نے کہا، اچھا میں تم کو اور تمہارے ساتھ (۸۰) مسلمانوں کو رہا کر دوں گا۔ حضرت عبداللہ نے یہ آخری شرط منظور کر لی کیونکہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کا بڑا فائدہ تھا کہ قید سے نجات ملتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جب اسی مسلمانوں کو حضرت عبداللہ اپنے ساتھ لے کر واپس آئے تو فاروقِ اعظمؓ کھڑے ہو گئے اور حضرت عبداللہ بن حذافہ کے سر کو بوسہ دیا۔

حضرت ابوجندلؓ آپ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مکہ میں قید بند کے دن گزار رہے تھے اور طرح طرح سے انھیں ستایا جا رہا تھا۔ عین اس وقت جب کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اور سفیرِ قریش کے درمیان معاہدہ لکھا جا رہا تھا۔ آپ کے پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے سفیرِ قریش ابوجندل کا باپ تھا اور اسلام کا مخالف تھا۔ اس نے بیٹے کو مکہ سے فرار ہو کر یہاں پہنچنے پر غضبناک نظروں سے دیکھا۔ حضورِ پرنور سے کہا۔ اس دفعہ کے مطابق کہ قریش کا کوئی فرد مکہ سے مدینہ چلا جائے تو واپس کر دیا جائے گا"۔ ابوجندل کو واپس کر دیا جائے۔

آنحضرت نے فرمایا۔ ذرا سوچو تو سہی ابھی تک تو معاہدہ قلمبند نہیں ہوا پھر کس رو سے اس کو واپس کر دیا جائے۔ بات اگرچہ معقول اور اصولی تھی لیکن سفیرِ قریش کو اس بات کا سننا گوارا نہ تھا کہ اور تو اور خود اس کا بیٹا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں رہے۔ لہذا وہ اپنی ضد پر اڑ گیا۔ حضورؐ کو مجبوراً اس کی بات ماننی پڑی۔

جب ابوجندل نے دیکھا کہ آنحضرت ان کو واپس کرنے پر آمادہ ہو گئے تو معاً اپنے جسم کے تمام زخم و نشان مسلمانوں کو دکھائے تاکہ کفار کی بے رحمی اور ایذا رسانی کا اندازہ ہو سکے اور نہایت بے بسی کے لہجے میں کہا۔ برادرانِ اسلام کیا تمہارا یہ مقصد ہے کہ پھر مجھ کو اسی حالتِ سابقہ میں دیکھو۔ مطلب یہ تھا کہ میرا مجروح جسم تمہارے سامنے ہے اس کے باوجود مجھ کو کافروں کے حوالے کرنا چاہتے ہو، کچھ تو میری مدد کرو۔ یہ وہ دردناک فریاد تھی جسے سن کر مسلمان تڑپ اٹھے۔ بالخصوص حضرت عمر فاروقؓ اس موقع پر قطعاً ضبط اور برداشت نہ کر سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ جب ہم حق پر ہیں تو یہ ذلت آمیز شرائط کیوں گوارا کی جائیں۔ آنحضرت نے فرمایا۔ عمر! میں پیغمبرِ خدا ہوں جو مشیتِ الٰہی یوں ہی ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔ خدا میری امداد ضرور کرے گا۔

ادھر ابوجندل سے فرمایا یا اباجندل اصبر واحتسب فان اللہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجا و مخرجا انا قد عقدنا بیننا و بین القوم صلحا و انا لا نغدر بھم یعنی ابوجندل

صبرو ضبط سے کام لو۔ خدا تمہارے لئے اور تمہارے ساتھی مظلوموں کے لئے کوئی راستہ نکالے گا صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی (کسی صورت سے) نہیں کر سکتے۔

جس آستانہ پر ابو جندل کفار کی نظروں سے بچ کر پہنچے تھے، اس کی دوری ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ ہو سکتی تھی لیکن کیا کرتے جبکہ حضورؐ کا حکم سن چکے تھے، آخر بھی ہوا کہ مکہ واپس چلے گئے۔ وہاں پہنچنے کے بعد کفر و شرک کی تاریکی سے متنفر ہو کر شام کے راستہ میں ایک مستقر قائم کیا۔ جب مکہ کے ستم رسیدہ اور بے بس مسلمانوں کو اس کا علم ہوا تو کفار کی نظروں سے بچ کر یہاں مقیم ہوئے۔

الغرض مسلمانوں کی ثابت قدمی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایمان ایک ایسی طاقت ہے جو جسموں پر نہیں، دلوں پر حکمرانی کرتی ہے۔ جس کی حقانیت اور صداقت کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ جو اس کے ذائقہ سے آشنا ہو جاتا ہے تو عمر بھر کے لئے ایسا گرویدہ رہتا ہے کہ اس کو بڑے سے بڑا مصائب کا سیلاب بہا نہیں سکتا۔ بڑے سے بڑا طوفانِ مصائب اس کے قدموں کو ڈگمگا نہیں سکتا۔ وہ ظلم و تشدد کو سر لیتا ہے اور بالآخر فتح اسی کی ہوتی ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بقیہ اختلاف امت اور سنت رسول — ص ۱۰

ایک اور مثال لیجئے۔ حضرت عمرؓ اپنے زمانہ خلافت میں ملک شام کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں سرغ مقام پر اطلاع ملی کہ شام میں شدید طاعون پھیل گیا ہے۔ اس موقع پر کچھ حضرات کا خیال تھا کہ واپس جایا جائے جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے اور بعض حضرات شام جانے پر مصر تھے۔ حضرت عمرؓ سے یہ بھی کہا گیا کہ

انفر من قدر اللہ :- کیا آپ تقدیر خدا سے بھاگتے ہیں ؟

جس پر انہوں نے جواب دیا

نفر من قدر اللہ الی قدر اللہ۔ ہم خدا کی تقدیر سے اسی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔

اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ حدیث پیش کی کہ

"جہاں وبا پھیلی ہو وہاں سے نہ کوئی نکلے۔ اور نہ کوئی ایسے علاقہ میں داخل ہو۔

اس پر حضرت عمرؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی کہ ان کی رائے حدیث کے موافق ہی نکلی۔

(زاد المعاد ج ۱ ص ... ، تاریخ الامۃ ج ۲ ص ۹۵)

ان چند مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرن اول میں سنت ملت کے لئے وجہ نزاع نہیں بلکہ اتحاد کی بنیاد تھی۔

جناب انیس احمد صاحب بی اے

آثارِ قاسمی

قسط نمبر ۹

فکر و حکمت قاسمی

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ تیرھویں صدی کے مجددین میں سے تھے۔ آپ نے ولی اللّٰہی حکمت و معارف کو اہلِ ہند کے لیے وقت کے نت نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے پیش کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے بے شمار علمی و عملی کارناموں میں یہ کارنامہ بڑا اہم ہے اور اس لیے آج بھی آپ کی قوت و عزیمت، فہم و فراست، اخلاق حمیدہ اور بلند پایہ تصانیف کے بڑے بڑے مدعیانِ عقل و تہذیب قائل ہیں۔

درحقیقت دیوبند سے تحریک کی امامت و قیادت کے لیے حضرت قاسم العلوم والخیرات کی ذات گرامی کا انتخاب قدرت کی طرف سے ہوا تھا اور یہ بات قدرتی ہے کہ اہل اللہ کی مرضیات کی تکمیل کا راستہ حقیقتاً اسباب پر دائر نہیں ہوتا بلکہ براہِ راست مسبب الاسباب سے تعلق رکھتا ہے اور یہ مسلّم امر ہے کہ مجتہدینِ دین کا رتبہ عام فقہا و محدثین سے نیابتِ رسولؐ میں اسی لیے بالاتر ہے کہ رسول شرائع اصلیہ لاتے ہیں اور مجتہدین ان سے شرائع وضعیہ نکال کر پیش کرتے ہیں جس سے انبیاء علیہم السلام کا دین مفصل و مدلل ہوتا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے نصب العین کی بنیاد تعلیمی نہضت تھی جس سے علم الٰہی کی شعاعیں پھوٹیں اور نہ صرف یہ تیرہ خاکدانِ ہند منور ہوا بلکہ قرب و جوار کے اسلامی ممالک میں علم حدیث اور علم اسرار دین کا چرچا ہونے لگا۔ تعلیمی نظام کے متعلق نوعمری ہی سے حضرت نانوتویؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ قلبی بیداری کے بغیر خالص دماغی بیداری اور عقلی ارتقا سے وہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے جن کی توقع ملی خدمات کی بجاآوری کے لیے ضروری ہے۔

حضرت قاسم العلوم کا علمی نظریہ ایک ایسا تجربی نظریہ تھا جس کی تائید مشاہدات سے ہوتی ہے، قرآن حکیم کا تربیتی اصول یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ تزکیہ لازم ہے البتہ ایک آیت میں تزکیہ کو تعلیم سے مقدم لایا گیا ہے۔ اور دوسری جگہ موخر جس سے اس مقصود کی طرف رہنمائی ملتی ہے کہ تعلیم سے مقدم تزکیہ علمی استعداد پیدا کرنے کا واسطہ ہے جس سے علم میں استقامت پیدا ہو اور تعلیم سے موخر تزکیہ قربِ حق کی استعداد و صلاحیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے تاکہ طالبین کے لیے راہِ سلوک آسان ہو جائے۔ الحاصل مقدم تزکیہ علمی قوت کی تکمیل کا ضامن

ور موثر تزکیہ عملی قوت کی تکمیل کا ضامن تھا اور انھیں دو قوتوں پر انسانی سیادت کا مدار ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر قوم کا نظامِ تعلیم اس کے مخصوص قومی خصائص اور ملی شعار کا آئینہ دار ہوتا ہے لئے وہ ملی نظامِ حیات کی برکات سے بھرپور ہوتا ہے ۔ تمام حکماء و مفکرین اس نکتہ پر متفق الرائے ہیں کا اولین مقصد حقیقت کی جستجو اور کمال کا حصول ہے اور تعلیم سے مراد طلبہ کی ذہنی حیات و جذباتی رجحانات ھار اور سنوار کر ان میں ملکۂ فائقہ پیدا کرنا ہے۔ تاکہ طلبہ کے دل علم کی لذت سے آشنا ہوں وہ کتاب خواں نہیں اور صاحبِ کتاب بھی ۔

ہمارا قدیم نظامِ تعلیم دینی تھا جس میں اخلاقی اور روحانی قدریں زیادہ واضح اور روشن تھیں اور معلمین علم و ب کا مرکز ہوتے تھے جو طلبہ کو ان کی ذہنی استعداد کے مطابق تعلیم دیتے تھے۔ اس نظامِ تعلیم میں طلبہ انفرادیت کو ابھرنے کا زیادہ موقع تھا کیونکہ قابلیت کا اصل معیار علمیت ہوتی تھی، علم کو علم کی خاطر یکھا اور سکھایا جاتا تھا۔ تجارتی سودے بازی یکسر مفقود تھی۔ اساتذہ کی سیرت طلبہ کے کردار کی تشکیل میں زنہ بلکہ ممد و معاون ہوتی تھی کیونکہ اساتذۂ کرام اپنی قلندرانہ سیرت و کردار سے اس خلاء کو پورا کرتے تھے علم کی مجبوری اور طلبہ کی کم رسائی کے سبب پیدا ہوتا تھا۔ یقین بالغیب اس تعلیم کا اہم نکتہ تھا۔ اس لئے یہ علیمی نظام قومی خصوصیات کا حامل تھا۔

یوں تو فکر کی آزادی تمدن کا بڑا سرمایہ ہے لیکن جب یہ مادہ پرستی کے غلط اندازِ فکر کے تحت نام نہاد آزادی فکر کے فریب میں قلب و نظر کا ساتھ چھوڑ کر اپنی انانیت قائم کرلے تو بڑے مہلک نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ موجودہ دور میں معاشرتی مفکرین اور ماہرینِ تعلیم نے دین سے فکر کو آزاد کیا اور محض مادی حالات اور معاشی ضروریات کے زیرِ اثر اپنی حکمت عملی مرتب کی۔ چنانچہ اس آزادیٔ فکر کی سزا بعد کی کئی نسلوں کو بھگتنی پڑی۔ ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے — قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

نئے زمانے کی نئی نسلوں نے دین سے بغاوت کی اور اخلاقیات و روحانیات کو نظر انداز کر کے مغرب کے رنگ افروز دامن میں پناہ ڈھونڈی مگر وہاں انھیں کیا ملا؛ اقبال کی زبانی سنئے ؎

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؛ — دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک

دیکھئے اس مغربی نظامِ تعلیم پر کیسی زبردست چوٹ ہے۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

الحاصل گزشتہ علمی دور میں اخلاق و روحانی قدریں زندہ تھیں۔ دینی نظامِ تعلیم میں فلاحِ دارین

ں۔ اُن قدیم درس گاہوں میں باقاعدہ نظم و ضبط بھی تھا اور نظام الاوقات بھی۔ اور نصاب بھی معین تھا لیکن اس کے باوجود ذہین اور طباع طلبہ پر کوئی پابندی عائد نہ تھی اور جہاں تک علم کے فوائد و برکات کا تعلق ہے کے بارے میں عارف رومیؒ کا کیا خوب ارشاد ہے ؎

علم را برتن زنی مارے بود علم را بردل زنی یارے بود

حضرت نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی اجتماعی تعلیم سے علم کی کمیت اور مقدار میں اضافہ ہوتا ہے یعنی اگر اہلِ علم کی تعداد میں اضافہ مقصود ہو تو اس کی علمی تدبیر یہی ہے کہ اجتماعی درس کو فروغ دیا ئے۔ اس طرح تعلیم یافتہ اصحاب کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا لیکن درس کے اس اجتماعی طریقہ میں نقصان پہلو یہ ہے کہ علم کی کیفیت روز بروز گھٹنے لگتی ہے یعنی طلبہ کی استعداد انحطاط و ضعف کا شکار ہو جاتی ہے گویا مدارس کے ذریعہ اہلِ علم کی تعداد ضرور بڑھ جاتی ہے مگر ذی استعداد، طباع اور بالغ نظر افراد کی پیدائش میں کمی آ جاتی ہے جب کہ انفرادی درس و تدریس میں اہلِ علم کی تعداد ضرور گھٹ جاتی ہے لیکن علم کی کیفیت بڑھ جاتی ہے یعنی انفرادی طور پر پڑھ کر جو حضرات فارغ التحصیل ہوتے ہیں وہ راسخ فی العلم، بالغ نظر اور طباع ہوتے ہیں، کیونکہ اس غیر مشینی طریقۂ تعلیم میں معلم تدریس کو مقدس فریضہ سمجھ کر طالبین کی ذہنی اور اخلاقی تربیت پر خصوصی توجہ دیتا ہے نیز متعلمین کی تعلیمی کیفیت، ذہنی استعداد اور رفتارِ ترقی از بس کہ پیشِ نظر رہتی ہے۔ اور اساتذہ کی خصوصی توجہ مبذول کرنے کے سبب متعلمین کی مخفی صلاحیتیں ابھارنے اور نکھارنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن مدتیں گزریں انفرادی تعلیم کا یہ طریقہ متروک ہو گیا۔ تاہم موجودہ زمانہ کے مشینی طریقۂ تعلیم میں بھی جہاں طلبہ کو کامل مشفق اور متبحر اساتذہ کا فیضان، ان کی نظرِ رنجی صحبت اور خصوصی توجہ میسر آ جاتی ہے وہ کندن ہو کر نکلتے ہیں۔ بہرکیف تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت اور روحانی فیضان لابدی ہے۔ اور یہ چیز متقی کی صحبت میں ملتی ہے کیونکہ یہ ایک بدیہی حقیقت بلکہ فطری امر ہے کہ شخصی تقویٰ و طہارت سے جماعتیں بنتی ہیں لیکن جماعتی حلقہ سے افراد تیار نہیں ہوتے۔ کیونکہ تقویٰ و طہارت کا کوئی رسمی لائحۂ عمل نہیں کہ اس پر چل کر آدمی متقی ہو جائے۔ تقویٰ کی صورت یہی ہے کہ طالبِ حق صمیمِ قلب کے ساتھ ایک مربی کا رنگ قبول کرے اور اس کے ساتھ مقررہ راستے پر اسی کی نگرانی اور رہنمائی میں چل کر منزلِ مقصود پر پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی ادارہ میں جماعتی افکار و خیالات یا شورائی طرزِ عمل کا تربیت میں دخل ہوا اور شخصی تربیت مفقود ہوئی اس وقت وہ ادارہ بے عمل بلکہ بے روح بن گیا۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ تعلیم و تربیت میں زبردست فرق ہے۔ تعلیم سب کے لئے یکساں ہوتی ہے مگر تربیت میں اشخاص کے مزاج اور طبیعت کی رعایت سے تدبیر کی جاتی ہے کیونکہ تعلیم کا مقصد علم دینا ہے اور تربیت کی غایت دیئے ہوئے علم پر عمل کرانا ہے جو ذوقِ عمل کا محرک ہے اور عمل سوزِ جگر کی دولت سے مالا مال کرا دیتا ہے۔ گو سوزِ دماغ بھی ایک حقیقت ہے مگر یہ سے ... نہیں ہو سکتا مغرب کے تعلیمی نظام میں سب سے

بدا نقص ہے کہ ؎
اہلِ دانش عام کم یاب ہیں اہلِ نظر   کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

چونکہ حضرت نانوتوی رح کو علمِ دین کی ترویج اور اسلام کی اشاعت و تبلیغ منظور تھی بنیز اپنے مخصوص جذبات اور مخصوص رنگ میں اخلاق و عمل سے آراستہ کر کے ایک خاص جماعت تیار کرنی تھی اس لئے ایک طرف دارالعلوم قائم فرمایا جس کے اصول اساسی میں عمومیت اور طریقِ عمل میں وسعت و ہمہ گیری رکھی، ایک شورائی حلقہ تجویز فرمایا اور اس کے احاطہ میں علماء و فضلاء و حکماء کی ایک جماعت لاکر بٹھادی اور دوسری جانب تربیتِ خاص کی حد تک اپنی ذاتِ گرامی کو مرکز بنایا۔ مستعد طالبین کو سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھ کر انھیں اپنے مخصوص رنگ میں رنگ دیا۔

حضرت قاسم العلوم والخیرات کی علمی افاضیت اور باطنی توجہات کا بازار گرم تھا جس سے نکلنے والے شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا احمد حسن محدث امروہوی، مولانا عبد العلی محدث دہلوی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا محی الدین اور مولانا عبد الحق جیسے اکابر تھے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اصولِ تربیت میں مربی کی طبعی افتاد اور ذاتی ذوق کو بڑا دخل ہوتا ہے کیونکہ اُن کی طبیعت سے ان کا طریق جدا نہیں ہو سکتا۔ حضرت نانوتوی رح بالطبع حلم و کرم اور رحمت و رافت کا مجسمہ تھے اسی لئے تربیتی معارف میں ان صفات کا رنگ نمایاں تھا اور افادہ میں جامعیت و ہمہ گیری کا بھی طبعاً غلبہ تھا۔

حضرت نانوتوی نے اپنی حکیمانہ بصیرت سے انسانی نفسیات و جبلت کے رموز سمجھ کر بے مثال نصاب تعلیم تجویز کیا تھا۔ آپ کے خیال کے مطابق تربیت عام ہو یا خاص۔ اس میں اس پہلو کا خاص لحاظ رکھنا چاہیئے جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو۔

یہ بات اہلِ عقل پر روشن ہو کہ تیرھویں صدی میں سلطنت افرنگ کے قیام کے بعد مغربی علوم کی تعلیم سرکاری مدارس کی کثرت کی وجہ سے اس ترقی پر تھی کہ علوم مذہبیہ کو سلاطینِ اسلام کے زمانہ میں بھی وہ ترقی و فروغ میسر نہ آیا تھا۔ علوم نقلیہ کا ایسا تنزل ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا۔ ایسے نازک وقت میں مدرسۃ العلوم میں علوم جدیدہ کی تعلیم تحصیل حاصل نظر آئی بلکہ خاص دینی اور اسلامی علوم کی تعلیم ضروری سمجھی گئی جن سے بقائے ایمان اور تحفظ دین بھی ہوا اور جدید علوم کی تعلیم میں بھی امداد ملے۔ مدرسۂ دیوبند کے نصاب میں یہ رعایت اسی لئے رکھی گئی تھی کہ دارالعلوم سے فارغ ہونے والے شوقین اور ذہین طلبہ سرکاری مدارس میں جاکر علوم جدیدہ پڑھیں تو ان کے کمال میں اضافہ ہو۔

آج ہمارے یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو مدرسہ کی تعلیم پر اعتراضات وارد کرتا ہے۔ اعتراض یا نکتہ چینی کوئی مشکل بات نہیں۔ جو حضرات دارالعلوم کے نصابِ تعلیم پر معترض ہوتے ہیں وہ یقیناً اس صد سالہ ادارے کے تاریخی پس منظر اور اس کی خدمات سے یکسر ناواقف ہیں۔ اغلباً وہ ماضی کو فراموش کر کے حال سے بیگانہ ہو کر روشن مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رح کا تعلیمی نصب العین ایک تاریخی نصب العین تھا جس نے آج تک برِصغیر میں نصرانیت و الحاد اور زندقہ کے طوفان کو روکے رکھا۔

[بقیہ صفحہ ۲۶ پر]

قدرت اور عادت کا باہمی امتیاز

جو لوگ خدا کی ہستی اور اس کے وجود کے قائل ہیں ناچار ان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ کی ایک قدرت ہے اور ایک ارادہ اور ایک اس کی عادت ہے اور یہ تینوں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

قدرت اور عادت میں بسا اوقات التباس ہو جاتا ہے مثلاً عام طور پر ایسے امور کے متعلق جو سلسلۂ اسباب و مسببات کے خلاف واقع ہوں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ امر قانونِ قدرت کے خلاف ہے اور اہلِ الحاد اسی بہانہ سے بہت سے صحیح مسائل کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ یہ امر قانونِ قدرت کے خلاف ہے، یہ لوگ اس لفظ کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت ہمارا روئے سخن دہریوں کی طرف نہیں بلکہ آریوں کی طرف ہے اور آریہ بھی قانونِ قدرت کا لفظ بہت استعمال کیا کرتے ہیں لیکن خود بھی پرمیشور کو "سروشکتیمان" (قادرِ مطلق) مانتے ہیں۔ جیسا کہ ہم خدا کو قادرِ مطلق مانتے ہیں پس اگر وہ واقعی سروشکتیمان اور قادرِ مطلق ہے تو اس کی قدرت میں یقیناً یہ داخل ہے کہ سبب کو بدون مسبب کے اور مسبب کو بدون سبب کے پیدا کر دے۔ مثلاً آگ موجود ہو مگر نہ جلاوے۔ یا کوئی چیز جل جاوے مگر آگ موجود نہ ہو۔ یا مثلاً ہم قادرِ مطلق کی عادت یہ دیکھتے ہیں کہ بچہ عورت کے رحم سے نکلتا ہے اور پھر بتدریج نشو و نما پاتا ہے چنانچہ کسی نے نہیں دیکھا ہوگا کہ کوئی جوان انسان آسمان سے اترا ہو یا زمین سے اُگ آیا ہو مگر اس عادتِ مستمرہ کے خلاف ماں کے رحم اور نطفہ کے توسط کے بدون انسان کو پیدا کرنا بھی اس سروشکتیمان کی قدرت میں داخل ہے۔ کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے کہ لیل و نہار کی طرح یہ عالم بھی فنا ہو کر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور جیسے رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی ہے اسی طرح عالم کا سلسلۂ فنا و بقا یکے بعد دیگرے جاری ہے اور عالم کے فنا کے زمانے کو وہ "پرلے" کا زمانہ کہتے ہیں اور اس وقت اُن کے خیال کے موافق سارا عالم فنا ہو جاتا ہے اور سب کچھ مٹ مٹا کر خدا کی ذات میں سما جاتا ہے اور جیسا کہ رگ وید میں تصریح ہے صرف پربرہم کی سامرتھ (یعنی خدا کی قدرت) باقی رہ جاتی ہے۔ باقی سب کچھ نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ ایک مدت دراز تک اسی طرح عالم فنا پڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے پھر پیدا ہوتا ہے۔

اب دنیا کا جو دور چل رہا ہے اس کا حساب سوامی دیانند نے نہ معلوم کس بہی کھاتہ سے لگا کر یہ کہا ہے کہ ایک ارب چھیانوے کروڑ کچھ لاکھ کچھ ہزار برس سے یہ دنیا موجود ہے۔ اس سے پہلے بے شمار مرتبہ دنیا ٹھ

اور پیدا ہوتی چلی آئی ہے اور موجودہ دور بھی جب خدا چاہے گا فنا ہو جائے گا۔

اس عقیدے کا رد اس وقت مقصود نہیں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ جب دنیا پرلے کے بعد نئے سرے سے پیدا ہوتی ہے تو مختلف مخلوقات خصوصاً انسان کہاں سے آتے ہیں؟

سوامی دیانند کہتے ہیں کہ "پرلے کے بعد انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کی پیدائش کی کیفیت متعارف طریقہ سے بالکل علیحدہ ہے یعنی ہزاروں انسان بغیر ماں باپ کے جوان محض خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ سے بدون متعارف سلسلۂ اسباب طبعیہ کے بن جاتے ہیں۔ اب جو مذہب یہ کہتا ہے وہ مذہب قطعاً حق نہیں رکھتا کہ وہ اس کے بعد سرو شکتیمان کو اس ظاہری اسباب میں ایسا جکڑ بند کر دے کہ خواہ کیسی ہی حکمت اور مصلحت کا اقتضا ہو مگر وہ ایک منٹ کے لیے ان اسباب کے سلسلہ سے الگ ہو کر کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے بھی مجبور اور عاجز ٹھہرے"۔

جب ان کے اعتراف کے موافق پرلے کے بعد اس عادۃ مستمرہ کے خلاف غیر متناہی دفعہ ایسا ہو چکا ہے اور ہوتا رہے گا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو خدا اب سے ایک ارب سال پہلے دپرلے کے بعد قادر تھا کہ بدون ماں باپ کے انسان کو پیدا اور بدون اسباب کے مسببات کو موجود کر دے اب اس کی قدرت کو کس چیز نے سلب کر لیا کہ ایک یا دو ارب سال کے بعد ایسا نہ کر سکے۔ معلوم ہوا کہ خرق عادت یعنی کبھی کبھی سلسلۂ اسباب سے علیحدہ ہو کر محض وسیع قدرت کے اظہار کے طور پر کوئی کام کرنا اس کی قدرت کے خلاف نہیں۔ ہاں عام عادت اور معمول کے خلاف ہوگا۔ لہٰذا اس کو قانون عادت کے خلاف کہنا صحیح ہو تو ہو مگر قانون قدرت کے خلاف قرار دینا اس لفظ کا غلط استعمال اور مغالطہ دینے والی تعبیر ہے۔

مثلاً اہل اسلام کے عقیدہ کے موافق ابراہیم خلیل اللہ کو آگ میں ڈالا گیا اور وہ نہ جلے تو خدا کی اس عام عادت کے تو خلاف ہوا جو آگ کے متعلق ہے کہ وہ جلانے کا سبب ہے لیکن قدرت کے خلاف نہ ہوگا جس نے اس میں یہ خاصۂ احراق ودیعت کیا ہے۔

آریوں کے چار رشیوں کے علاوہ کسی اور سے خدا کا ہمکلام ہونا قدرت کے خلاف نہیں البتہ عادت کے خلاف ہے

آریہ کہتے ہیں کہ ہر پرلے کے بعد چار ویدوں کا الہام چار معین اشخاص پر ہوتا ہے جن کے نام بھی لکھے ہیں۔ وایو۔ اگنی انگرا۔ اودتیہ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چار رشی ہیں۔ گو تاریخ ایسے ممتاز انسانوں کا کوئی پتہ نہیں دیتی اور نہ ان کی کوئی سوانح بتلا سکی ہے بلکہ ان کو چار انسان بتانا بھی سوامی دیانند کی کوشش کا نتیجہ ہے جو ان ہی کے دائرۂ اثر تک محدود ہے۔ دوسرے بڑے بڑے فرقے ہنود کے اس کی تشریح دوسری طرح پر کرتے ہیں تاہم مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ آریہ سماج کے نزدیک ہر پرلے کے بعد ان ہی چار رشیوں پر چار ویدوں کا الہام جگ کی ابتدا میں ہوتا ہے۔ بعد میں کوئی کتاب کسی پر نہیں اترتی اور ہر پرلے کے بعد وہی چار وید اترتے ہیں جو کہ

پہلے اتر چکے ہیں۔ ان میں بھی تغیر اور تبدّل نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ ان ہی چار رشیوں سے ابتدائے آفرینش میں کلام کرتا ہے اور کسی سے نہیں کرتا۔ گویا خدا کا بندوں سے ہمکلام ہونا اس کی عام عادت نہیں بلکہ خاص عادت ہے جو خاص زمانہ میں مخصوص بندوں کی نسبت ظاہر ہوتی ہے حالانکہ خدا اس سے مجبور اور عاجز نہیں کہ اگر وہ چاہے تو کسی اور سے بھی کسی وقت کلام کرلے۔ تو مجھے اس وقت یہ کہنا ہے کہ خود آریوں کے اصول کے موافق بھی دو چیزیں الگ الگ ہوئیں۔ ایک قدرت اور ایک عادت۔ اور یہ کہ عادت کے خلاف کوئی کام کرنا بھی قدرت سے خارج نہیں ہے پس اسباب سے سبب کا پیدا کرنا خدا کی عادت ہے۔ اور بلا سبب کے مسبب بنا دینا قادرۃ کا کام ہے اسباب کا سارا سلسلہ قدرۃ کا بنایا ہوا ہے۔ نہ یہ کہ قدرت اسباب کی بنائی ہوئی ہے اور اس لئے قدرۃ تو اسباب پر حاکم ہوئی لیکن اسباب معاذ اللہ قدرت کے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈال سکتے۔ قرآن کریم نے بھی قدرت اور عادت میں فرق کیا ہے:۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۞ اگر خدا چاہتا تو وہ قتل نہ ہوتے لیکن خدا جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے

یہ تو اللہ کی قدرت اور ارادہ کا تفاوت ہوا۔ اب عادت کا بیان سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ — یہ ہی نظرت نیچر ہے جس پہ خدا نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کے (قانون) پیدائش کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۞ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۞ — خدا کی عادت میں تم ہرگز کوئی تبدّل و تغیر نہ پاؤ گے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۞ — یہ خدا کی عادت ہے جو اپنے بندوں کے متعلق چلی آئی ہے۔

یہ غیر متبدل سنت اللہ عادۃ اللہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ عادت اور قدرت میں فرق ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ عمامہ باندھنے کا عادی ہے۔ یا کوئی ہمیشہ چاول کھاتا ہے، یہ تو اس کی عادت ہوگی۔ مگر باوجود اس کے بھی وہ ٹوپی اوڑھنے یا روٹی کھانے پر قادر ہے۔ اسی کا نام قدرت ہے۔ ہر انسان اپنے اندر اس بات کو پاتا ہے مثلاً لڑکا اپنے ناتواں باپ کو مار سکتا ہے (یہ اس کی قدرت ہے) مگر نہیں مارتا۔ یہ اس کی عادت ہے

(بقیہ مآثر قاسمی صـ۲۳) اس طی نصب العین کے تحت ملک کے طول و عرض میں دینی مدارس کا اسی طرح جال بچھایا گیا جیسے حکومت نے انگریزی مدارس جگہ جگہ کھولے تھے، قومی سرمایہ سے چلنے والے مدارس کو نظم و ضبط کے وحدانی قالب میں ڈھالا گیا کہ کثرت جب وحدت کے نظام میں آجاتی ہے تو قوت کا سرچشمہ بن جاتی ہے اور عمدہ نتائج کی ضامن ــــ چنانچہ حضرت نانوتویؒ نے مدرسہ کے انصرام کے لئے آٹھ اساسی اصول ارقام فرمائے تھے جن پر دار العلوم دیوبند کی انتظامی بنیاد رکھی گئی ــــ وہ آٹھ اساسی اصول یہ ہیں ــــ: (آئندہ)

* * * * *

حضرت جبرئیل دربارِ نبوۃ میں

(از مولانا بدرالدین صاحب فاضل، دیوبند)

وعن عمر ابن خطابؓ قال بینما نحن عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم اذ
طلع علینا رجل شدید بیاض الثیاب شدید سواد الشعر لا یری علیہ اثر السفر ولا یعرفہ
منا احد حتی جلس الی النبیؐ فاسند کبتیہ الی کبتیہ ووضع کفیہ علی فخذیہ وقال یا محمدؐ اخبرنی
عن الاسلام قال الاسلام ان تشہد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ وتقیم الصلوٰۃ و
توتی الزکوٰۃ وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیہ سبیلا۔ قال صدقت فعجبنا
لہ یسئالہ ویصدقہ قال فاخبرنی عن الایمان قال ان تومن باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ
والیوم الاٰخر وتومن بالقدر خیرہ وشرہ، قال صدقت۔
قال فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔
قال فاخبرنی عن الساعۃ قال ما المسئول عنہا باعلم من السائل قال فاخبرنی عن اماراتہا قال
ان تلد الامۃ ربتہا وان تری الحفاۃ العراۃ العالۃ رعاء الشاء یتطاولون فی البنیان قال
ثم انطلق فلبثت ملیا۔ ثم قال لی یا عمر اتدری من السائل قلت اللہ ورسولہ اعلم، قال
فانہ جبرئیل اتاکم یعلمکم دینکم (رواہ مسلم)۔

حضرت عمر ابن خطابؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر تھے۔ اچانک نہایت سفید پوش اور سیاہ زلفوں والا ایک شخص آیا۔
اس شخص پر سفر کے آثار بھی نمایاں نہیں تھے۔ اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اُسے جانتا تھا۔ یہ آتے ہی (بے تکلفی سے) آنحضرتؐ کے زانوئے مبارک سے اپنا گھٹنا ملا کر بیٹھ گیا۔ (اور اس سے زیادہ بے تکلفی یہ کہ) اپنا ہاتھ حضورؐ کی ران مبارک پر رکھ کر اطمینان سے سوالات کرنے لگا۔
پوچھا اے محمدؐ مجھے بتایئے کہ اسلام کیا چیز ہے؟
حضور نے ارشاد فرمایا۔ اسلام یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے ایک ہونے کی گواہی دو اور محمدؐ کو اللہ کا رسول سمجھو، نماز پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان شریف کے روزے رکھو، اور اگر تم میں طاقت ہو تو بیت اللہ

شریف کا حج کرو۔

(اس پر نووارد مہمان نے کہا) آپ نے صحیح فرمایا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس کے اس جملہ پر حیرت ہوئی کہ یہ خود ہی سوال کرتا ہے، اس کا مطلب یہ کہ یہ خود اس سے ناواقف نہیں ہے۔ اور پھر جواب پاکر اس کی تصدیق کرتا ہے، اس کا مطلب یہ کہ یہ اس جواب سے واقف ہے۔ پھر سائل نے سوال کیا (اے محمدؐ) مجھے ایمان کے بارے میں بھی بتلایئے اس کی کیا حقیقت ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ پر دل سے یقین رکھو، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور آخرت کے دن پر جو تمام اچھے بُرے کاموں کے بدلے کا دن ہوگا۔ اس پر یقین رکھو اور تقدیر پر یقین رکھو کہ جو کچھ بھی اچھا بُرا معاملہ زندگی میں پیش آتا ہے یہ سب خدا تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق ہے۔

سائل نے اس جواب کی بھی تصدیق کی۔ اور پھر سوال کیا کہ اچھا احسان کے بارے میں بھی مجھے بتایئے اس کی کیا حقیقت ہے؟

حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ خداوند قدوس تمہارے سامنے موجود ہے۔ اور تم اسے دیکھ رہے ہو تاکہ تمہاری عبادت میں صحیح خشوع خضوع اور بندگی کی کیفیت پیدا ہوسکے اور اگر یہ ممکن نہیں تو کم از کم یہ خیال تو ضرور ہونا چاہیئے کہ خداوند کریم تمہیں دیکھ رہا ہے اور تمہاری عبادت کی حقیقت سے واقف ہے۔ پھر سائل نے سوال کیا۔ اچھا قیامت کے وقت کے متعلق کچھ بتلایئے۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ اس کے وقت کے بارے میں جس سے سوال کیا جارہا ہے وہ بھی سائل سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا

سائل نے کہا کم از کم قیامت کی کچھ علامتیں اور نشانیاں تو بتایئے۔

حضورؐ نے فرمایا۔ اس کی نشانیاں یہ ہیں کہ باندی اپنے محسن اور مربی کو خود پیدا کرے گی۔ یہ کثرت زنا کی طرف اشارہ ہے کہ لڑکیاں اپنی ماؤں کی پرورش کا ذریعہ ثابت ہوں گی۔ یا— عقوق والدین کی طرف اشارہ ہے کہ اولاد اس درجہ نافرمان اور صاحب تحکم ہوگی گویا کہ ماں نے اپنے مربی کو جنا ہے ————

اور قیامت کی نشانیاں یہ ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ننگے پیر اور ننگے بدن پھرنے والی قومیں ——، اور معمولی چرواہے بھی بڑی بڑی عمارتیں بناکر ان میں فخر و مباہات کی زندگی گذار رہے ہوں گے۔

یہ جوابات سننے کے بعد سائل رخصت ہوگیا اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں بیٹھا رہا۔

تھوڑی ہی دیر میں آنحضرتؐ نے مجھ سے فرمایا۔ عمرؓ تم جانتے ہو یہ سائل کون تھا!

میں نے کہا۔ اللہ اور اللہ کا رسول ہی اس سے خوب واقف ہے۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا یہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمہارے دین کی باتیں سکھانے آئے تھے۔

حدیث شریف کا مفہوم تو ترجمہ میں صاف ہو گیا۔ مزید تشریح کرنے کے لئے چند باتیں اور واضح کر دینی ضروری ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ دین کے احکام سمجھانے کے لئے باری تعالیٰ نے کیسا دل نشین انداز اختیار کیا کہ سوالات کے ذریعہ امتِ محمدیہ کو اسلام کے بنیادی احکام کی تعلیم دی۔ دوسری بات یہ کہ اس حدیث میں اسلام اور ایمان کا الگ الگ سوال کر کے دونوں کا فرق ظاہر کر دیا۔

ظاہری اقرار اور خدا کو قبول کر لینے کا نام اسلام ہے۔ اور قلبی یقین اور دین کے دل میں پیوستہ ہو جانے نیز اللہ تعالےٰ کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور رسولوں پر یقین کر لینے کا نام ایمان ہے۔

اس کے بعد آخرت اور تقدیر کا ذکر کر کے یہ بات صاف کر دی گئی کہ زندگی میں پیش آنے والے اچھے برُے حالات سب من جانب اللہ اور تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں تاکہ انسان ان حوادثات سے پریشان ہو کر اپنا چین و سکون نہ کھو بیٹھے۔ نیز جزا اور سزا کے دن پر یقین کرنے کے ساتھ اپنے اعمال کو گندگی سے آلودہ نہ ہونے دے اور اپنی زندگی کو اچھے اعمال سے مزین کرے۔

چوتھی چیز: عبادت میں خلوص اور للّٰہیت، بندگی میں روح اور صحیح کیفیت پیدا کرنے کے لئے احسان کی تشریح کی گئی۔

پھر آخر میں قیامت کے متعلق وضاحت کی گئی کہ اس کے وقت کی واقفیت ضروری نہیں بلکہ قیامت کی تیاری کے لئے اپنے اعمال کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے اور قیامت کا قریب ہونا اس کی نشانیوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔

بقیہ الطاف القدس ــ ● کی قید نے اب اس کو نفس ناطقہ کہلوایا، اب یہ نفس ناطقہ اور وہ صورت اجمالی دونوں ملکر اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں بالکل ایسے جیسے ہم لاکھوں تصورات کو نہاں خانۂ دماغ میں لئے لئے پھرتے ہیں پھر بھی مشترکہ قوت انسان کو حظیرۃ القدس تک دوڑاتی ہے، یہیں سے اعمال کی تقسیم سجین یا علیین کی صورت میں ہو جاتی ہے، اگر آدمی نیک عمل کرتا ہے تو اس کی صورت مثالیہ اجمالیہ میں سفید نقطے ظاہر ہو جاتے ہیں اور اگر برُے عمل کرتا ہے تو سیاہ نقطے پھوٹتے ہیں۔ یہی صورت آخرت میں انسانی جسم کے ساتھ ساتھ ہو جائے گی۔ اس طور پر ہاتھ پاؤں کا بولنا، اعمال نامے کا سامنے آنا سب کچھ ہو جائے گا۔

شریف ...

... خود ارد ...

حیرت ہوئی کہ یہ خود ...

پاکر اس کی تصدیق کرتا ...

محمدؐ مجھے ایمان کے ...

تم خدا تعالیٰ پر دل سے ... ل ...

برے کاموں کے ... ین رکھو ...

ہر پیش آتا ہے یہ ... کے مطابق ہے

سائل نے ... کی۔ اور پھر سوال کیا

اس کی کیا حقیقت ...

حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ... تمہارے سامنے موجود ہے۔ اور تم اسے دیکھ رہے ہو تاکہ تمہاری ... خضوع ... کی کیفیت پیدا ہو سکے اور اگر یہ ممکن نہیں تو کم از کم یہ خیال تو ضرور ہونا چاہیئے کہ ... اگر تم تمہیں دیکھ رہا ہے اور تمہاری عبادت کی حقیقت سے واقف ہے۔ پھر سائل نے سوال کیا۔ اچھا قیامت کے وقت کے متعلق کچھ بتلایئے۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ اس کے وقت کے بارے میں جس سے سوال کیا جا رہا ہے وہ بھی سائل سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا ... سائل نے کہا کم از کم قیامت کی کچھ علامتیں اور نشانیاں تو بتایئے۔

حضورؐ نے فرمایا۔ اس کی نشانیاں یہ ہیں کہ باندی اپنے محسن اور مربی کو خود پیدا کرے گی۔ یہ کثرت زنا کی طرف اشارہ ہے کہ لڑکیاں اپنی ماؤں کی پرورش کا ذریعہ ثابت ہوں گی۔ یا عقوق والدین کی طرف اشارہ ہے کہ اولاد اس درجہ نافرمان اور صاحب تحکم ہو گی گویا کہ ماں نے اپنے مربی کو جنا ہے ______

اور قیامت کی نشانیاں یہ ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ننگے پیر اور ننگے بدن پھرنے والی قومیں ____، اور معمولی چرواہے بھی بڑی بڑی عمارتیں بنا کر ان میں فخر و مباہات کی زندگی گذار رہے ہوں گے۔

یہ جوابات سننے کے بعد سائل رخصت ہو گیا اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں بیٹھا رہا۔

تھوڑی ہی دیر میں آنحضرت نے مجھ سے فرمایا۔ عمر تم جانتے ہو یہ سائل کون تھا!

میں نے کہا۔ اللہ اور اللہ کا رسول ہی اس سے خوب واقف ہے۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا یہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمہارے دین کی باتیں سکھانے آئے تھے۔

حدیث شریف ...

کر دینی ضروری ہیں۔

پہلی بات تو یہ ...

کیا کہ سوالات کے ذر...

اس حدیث میں اسلام او...

ظاہری اقرار اور دل...

پیوستہ ہو جائے نیز اللہ تعا... ین کر لینے کا

نام ایمان ہے۔

اس کے بعد آخرت اور تقدیر کا ذکر کر کے یہ بات صاف ... زندگی میں پیش آنے والے اچھے برے حالات سب من جانب اللہ اور تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں تاکہ انسان ان حوادثات سے پریشان ہو کر اپنا چین و سکون نہ کھو بیٹھے۔ نیز جزا و سزا کے دن پر یقین کرنے کے ساتھ اپنے اعمال کو گندگی سے آلودہ نہ ہونے دے اور اپنی زندگی کو اچھے اعمال سے مزین کرے۔

[illegible] عبادت میں خلوص و للہیت، بندگی میں روح اور صحیح کیفیت پیدا کرنے کے لئے [illegible] کی گئی۔

[illegible] کے متعلق وضاحت کی گئی کہ اس کے وقت کی واقفیت ضروری نہیں بلکہ قیامت [illegible] اپنے اعمال کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے اور قیامت کا قریب ہونا اس کی نشانیوں [illegible] ہے۔

[illegible] ● کی قید نے اب [illegible] س کو نفس ناطقہ کہلوایا، اب یہ نفس ناطقہ اور وہ صورت اجمالی دونوں بلکہ اپنے [illegible] ہیں بالکل ایسے جیسے ہم لاکھوں تصورات کو نہاں خانۂ دماغ میں لئے لئے پھرتے ہیں پھر بھی منتشر کر قوت [illegible] تک دوڑاتی ہے، یہیں سے اعمال کی تقسیم سجین یا علیین کی صورت میں ہو جاتی ہے، اگر آدمی [illegible] اس کی صورت مثالیہ اجمالیہ میں سفید نقطے ظاہر ہو جاتے ہیں اور اگر برے عمل کرتا ہے تو سیاہ نقطے پھوٹتے ہیں۔ یہی صورت آخرت میں انسانی جسم کے ساتھ ساتھ ہو جائے گی۔ اس طور پر ہاتھ پاؤں کا بولنا، اعمال نامے کا سامنے آنا سب کچھ ہو جائے گا۔

شریف کا حج کرو۔

(اس پر نو وارد مہمان نے کہا) آپ نے صحیح فرمایا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس کے اس جملہ پر حیرت ہوئی کہ یہ خود ہی سوال کرتا ہے، اس کا مطلب یہ کہ یہ خود اس سے واقف نہیں ہے۔ اور پھر جواب پاکر اس کی تصدیق کرتا ہے، اس کا مطلب یہ کہ یہ اس جواب سے واقف ہے۔ پھر سائل نے سوال کیا اے محمدؐ مجھے ایمان کے بارے میں بھی بتلایئے اس کی کیا حقیقت ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، ایمان یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ پر دل سے یقین رکھو، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور آخرت کے دن پر جو تمام اچھے بُرے کاموں کے بدلے کا دن ہوگا۔ اس پر یقین رکھو اور تقدیر پر یقین رکھو کہ جو کچھ بھی اچھا بُرا معاملہ زندگی میں پیش آتا ہے یہ سب خدا تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق ہے۔

سائل نے اس جواب کی بھی تصدیق کی۔ اور پھر سوال کیا کہ اچھا احسان کے بارے میں بھی مجھے بتایئے اس کی کیا حقیقت ہے؟

حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ خداوند قدوس تمہارے سامنے موجود ہے۔ اور تم اسے دیکھ رہے ہو تاکہ تمہاری عبادت میں صحیح خشوع خضوع اور بندگی کی کیفیت پیدا ہو سکے اور اگر یہ ممکن نہیں تو کم از کم یہ خیال تو ضرور ہونا چاہیئے کہ خداوند کریم تمہیں دیکھ رہا ہے اور تمہاری عبادت کی حقیقت سے واقف ہے۔ پھر سائل نے سوال کیا۔ اچھا قیامت کے وقت کے متعلق کچھ بتلایئے۔

حضور نے ارشاد فرمایا۔ اس کے وقت کے بارے میں جس سے سوال کیا جا رہا ہے وہ بھی سائل سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا سائل نے کہا کم از کم قیامت کی کچھ علامتیں اور نشانیاں تو بتایئے۔

حضورؐ نے فرمایا۔ اس کی نشانیاں یہ ہیں کہ باندی اپنے محسن اور مربی کو خود پیدا کرے گی۔ یہ کثرت زنا کی طرف اشارہ ہے کہ لڑکیاں اپنی ماؤں کی پرورش کا ذریعہ ثابت ہوں گی۔ یا۔ عقوق والدین کی طرف اشارہ ہے کہ اولاد اس درجہ نافرمان اور صاحب تحکم ہوگی گویا کہ ماں نے اپنے مربی کو جنا ہے ——————

اور قیامت کی نشانیاں یہ ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ننگے پیر اور ننگے بدن پھرنے والی قومیں ——، اور معمولی چرواہے بھی بڑی بڑی عمارتیں بنا کر ان میں فخر و مباہات کی زندگی گذار رہے ہوں گے۔

یہ جوابات سننے کے بعد سائل رخصت ہوگیا اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں بیٹھا رہا۔

تھوڑی ہی دیر میں آنحضرت نے مجھ سے فرمایا۔ عمر تم جانتے ہو یہ سائل کون تھا!

میں نے کہا۔ اللہ اور اللہ کا رسول ہی اس سے خوب واقف ہے۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا یہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمہارے دین کی باتیں سکھانے آئے تھے۔

حدیث شریف کا مفہوم تو ترجمہ میں صاف ہوگیا۔ مزید تشریح کرنے کے لئے چند باتیں اور واضح کردینی ضروری ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ دین کے احکام سمجھانے کے لئے باری تعالیٰ نے کیسا دلنشین انداز اختیار کیا کہ سوالات کے ذریعہ امتِ محمدیہ کو اسلام کے بنیادی احکام کی تعلیم دی۔ دوسری بات یہ کہ اس حدیث میں اسلام اور ایمان کا الگ الگ سوال کرکے دونوں کا فرق ظاہر کردیا۔

ظاہری اقرار اور خدا کو قبول کرلینے کا نام اسلام ہے۔ اور قلبی یقین اور دین کے دل میں پیوستہ ہوجانے نیز اللہ تعالےٰ کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور رسولوں پر یقین کرلینے کا نام ایمان ہے۔

اس کے بعد آخرت اور تقدیر کا ذکر کرکے یہ بات صاف کردی گئی کہ زندگی میں پیش آنے والے اچھے بُرے حالات سب من جانب اللہ اور تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں تاکہ انسان ان حوادثات سے پریشان ہوکر اپنا چین و سکون نہ کھو بیٹھے۔ نیز جزا اور سزا کے دن پر یقین کرنے کے ساتھ اپنے اعمال کو گندگی سے آلودہ نہ ہونے دے اور اپنی زندگی کو اچھے اعمال سے مزین کرے۔

چوتھی چیز۔ عبادت میں خلوص اور للّٰہیت، بندگی میں روح اور صحیح کیفیت پیدا کرنے کے لئے احسان کی تشریح کی گئی۔

پھر آخر میں قیامت کے متعلق وضاحت کی گئی کہ اس کے وقت کی واقفیت ضروری نہیں بلکہ قیامت کی تیاری کے لئے اپنے اعمال کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے اور قیامت کا قریب ہونا اس کی نشانیوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔

بقیہ الطاف القدس ● کی قید نے اب اس کو نفس ناطقہ کہلوایا، اب یہ نفس ناطقہ اور وہ صورت اجمالی دونوں ملکر اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں بالکل ایسے جیسے ہم لاکھوں تصورات کو نہاں خانۂ دماغ میں لئے لئے پھرتے ہیں پھر بھی مشترکہ قوت انسان کو حظیرۃ القدس تک دوڑاتی ہے، یہیں سے اعمال کی تقسیم سجین یا علیین کی صورت میں ہوجاتی ہے، اگر آدمی نیک عمل کرتا ہے تو اس کی صورت مثالیہ اجمالیہ میں سفید نقطے ظاہر ہوجاتے ہیں اور اگر بُرے عمل کرتا ہے تو سیاہ نقطے پھوٹتے ہیں۔ یہی صورت آخرت میں انسانی جسم کے ساتھ ساتھ ہوجائے گی۔ اس طور پر ہاتھ پاؤں کا بولنا، اعمال نامے کا سامنے آنا سب کچھ ہوجائے گا۔

لبِ جو

مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی صاحب

ودارعِ خاورِ مشرق سے ہے اُداس فضا
سلا رہی ہے نہالوں کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
ردا لئے ہوئے آتی ہے شب کی شہزادی
نظر سے چھپنے لگا منظرِ نظر افزا
مچل کے گود میں طوفاں کی سو گئیں موجیں
ہوا ہے شور سے خالی کنارۂ دریا
قطار باندھ کے طائر چلے نشیمن کو
اُبھر رہا ہے فلک پر کوئی کوئی تارا
سُبک خرام ہوئی ہے ہوائے تیز خرام
کبھی کبھی کوئی آتی ہے ڈوبتی سی ندا

حیات معتکفِ ظلمتِ شبانہ ہوئی
اُٹھی زمیں سے سوئے آں فلک روانہ ہوئی

ہر ایک چیز پہ جادو ہے شب کی آمد کا
حیات ہو گئی آسودۂ غمِ فردا
مگر یہ دل کہ ابھی ہے سکوں سے بیگانہ
مثالِ لالۂ صحرا بساطِ گل سے جدا
اسے پسند نہیں دن کی غوغا آرائی
شریکِ شورشِ محفل ہے اور پھر تنہا
کنارِ آب، یہ چاروں طرف سے سنّاٹا
درونِ سینہ مگر حشرِ اضطراب بپا
یہ صبح و شام اندھیرا ابھی ہے اُجالا بھی
یہ ہست و بود، یہ پستی، وہ عالمِ بالا
یہ اِس طرح کا تسلسل کہ ہے، نہیں بھی ہے
اسی میں کوئی ہے "ثابت" کوئی ہے "سیّارا"
یہ اِس طرح کے سفر کا مآل کیا ہوگا
یہ نکتہ دل پہ کسی طور بھی نہیں کھلتا
خرد سے کوئی جواب اس کا بن نہیں پڑتا
کہ یہ غریب ہے خود کشتۂ چگون و چرا
تخیلات کا یہ وردِ جز رجاری تھا
کہ ایک کوکبِ زرّیں نے صاف صاف کہا

"دو عالم از اثرِ شعلۂ جمالش سوخت
بجز متاعِ محبت کہ در پناہِ من است"

ابنِ سعود اور فتح ریاض

قسط نمبر ۲

ذرا سی دیر نہ گزری تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک آدمی نے سر نکالا۔ کمرے کی روشنی میں جو اس کے پیچھے سے آرہی تھی انہوں نے اس کو دیکھا اور فوراً ہی دو آدمیوں نے اس کو اس طرح دبوچ لیا کہ اس کے منہ سے ایک آواز بھی نہ نکل سکی۔ اب یہ سب کے سب مکان کے اندر گھس آئے اور دروازوں کو اندر سے بند کر دیا جو امیر محل کا بہت پرانا ملازم تھا اب جو اس نے روشنی میں ابن سعود کا چہرہ دیکھا تو اس کی زبان سے بیساختہ یہ الفاظ ادا ہوئے "یہ تو ہمارا آقا عبدالعزیز ہے"۔ یہ کہنا تھا کہ فوراً ہی اس کا سارا گھرانا سلام کرنے کو جمع ہو گیا ان سے اس کو ساری خبریں شہر کی اور امیر کی مل گئیں۔ اس نے کہا۔

قلعہ رشید کے سپاہیوں سے بھرا ہوا ہے، مگر انہوں نے کوئی بڑا انتظام کسی خاص احتیاط کا نہیں کیا ہے اور نہ اُن کو کسی کے حملہ کا اندیشہ ہے۔ امیر عموماً قلعہ میں رات کو سونے کے لئے چلا جاتا ہے اور صبح کو دن نکلنے پر آتا ہے۔ پہلے وہ اپنے حفاظتی دستہ کے گھوڑوں کا معاینہ کرتا ہے اور پھر کبھی پیدل اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے محل کو چلا جاتا ہے۔ مگر محافظ دستہ ہمیشہ ساتھ ہوتا ہے۔ محل پر کوئی پہرہ نہیں رہتا لیکن قلعہ پر ہر وقت پہرہ رہتا ہے اور یہ صرف دو دروازے چھوڑ کر واقع ہے۔

ان خبروں کو حاصل کرکے ابن سعود اور اس کے ساتھی جو امیر کے مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور جھکے جھکے اگلے مکان کی چھت پر آئے اور پھر نیچے آنگن میں اتر آئے۔ انہوں نے دالان میں ایک مرد اور ایک عورت کو سوتا ہوا دیکھا اور بڑی پھرتی سے ان کو انہی کے کپڑوں میں لپیٹ کر باندھ دیا۔

اس گھر سے ملا ہوا مکان وہ محل تھا جس میں حاکم کے اہل و عیال رہتے تھے۔ یہ اس مکان سے ایک منزل اونچا تھا۔ اب وہ سب پھر چھت پر چڑھے اور ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہو کر محل کی چھت پر چڑھ گئے۔ یہاں آہٹ لینے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے چھت پر لیٹ گئے۔ جب کوئی آواز کسی طرف سے نہ آئی تو انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کو نہ کسی نے دیکھا اور نہ ان کی آہٹ کسی کو ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے جوتے اُتار کر باندھ لئے۔ اور اب ننگے پاؤں ہلکے ہلکے قدموں سے آگے کو چلے۔ ایسے کہ کسی کے کان میں اُن کے پاؤں کی چاپ نہ آسکے۔ زینے سے ہو کر پھر وہ نیچے اتر آئے۔ انہوں نے نوکروں کو محل کے نیچے کے

ایک کمرے میں سوتا ہوا پایا اور وہیں ان کو بند کرکے کمرے پر پہرہ لگا دیا۔ پھر وہ دوسری منزل میں حاکم کے آرام کرنے کے کمرے میں آئے۔ ابن سعود نے احتیاطاً رائفل میں گولی ڈال لی۔ باقی آدمیوں کو دروازے پر چھوڑا۔ اور جلوی کو ساتھ لئے آگے کی طرف بڑھا۔ جلوی کے ایک ہاتھ میں موم بتی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ اس کو ڈھانپے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا۔ دونوں پاؤں کے پنجوں پر چل رہے تھے۔ کمرے کو طے کرکے جب وہ دیوار کے پاس آئے تو ان کی نظر ایک پلنگ پر پڑی جس پر دو شخص سوتے معلوم ہوئے۔ ابن سعود ہلکے قدموں سے پلنگ تک آگیا تو دیکھا کہ دو عورتیں سو رہی ہیں۔ یہ دو بہنیں تھیں جن میں سے ایک حاکم کی بیوی تھی۔ بیوی کی آنکھ کھل گئی اور وہ خوفزدہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔ ابن سعود نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کر لیا اور جلوی نے اس کی بہن کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کو کوئی آواز منہ سے نکالنے سے بند کر دیا۔

حاکم کی بیوی شہر ہی کی تھی، اس کا نام مطلبہ تھا۔ اس کا باپ عبدالرحمٰن کے پاس محل میں ملازم تھا۔ ابن سعودؒ اسے خوب پہچانتا تھا۔ اس نے کہا۔ "مطلبہ اگر تونے کوئی آواز منہ سے نکالی تو میں تجھے مار ڈالوں گا۔ تونے بڑا کمینہ پن کیا ہے کہ اس شمار سور کے ساتھ نکاح کر لیا ہے"۔

مطلبہ:۔ "ہمارے آقا میں کمینی نہیں ہوں، میں کیا کرتی جب آپ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب آپ کس کام کی غرض سے یہاں آئے ہیں؟"۔

ابن سعود:۔ "میں عجلان کو مارنے کے لئے یہاں آیا ہوں"۔

مطلبہ۔ "عجلان تو قلعہ میں ہے۔ اس کے پاس اسی مسلح جوان حفاظت کے لئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں آئے آپ کے لئے یہ بہتر ہے کہ آپ اپنی جان بچا کر بھاگ جائیں"۔

ابن سعود:۔ "عجلان یہاں کب آتا ہے"۔

مطلبہ:۔ "وہ سورج نکلنے سے ایک گھنٹہ کے بعد ہی آتا ہے، پہلے نہیں آتا"۔

ابن سعود:۔ "اچھا اب خاموش رہنا۔ اگر ذرا سی آواز بھی نکالی تو تمہارے گلے پر چھری پھیر دیں گے"۔ یہ کہا اور پھر دونوں عورتوں کو بھی یہاں سے لے جا کر نوکروں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں بند کر دیا۔

رات بہت کچھ گزر گئی تھی۔ اب صرف چار گھنٹے صبح ہونے میں باقی تھے۔ اس نے مکان کا جائزہ لیا اور فوجی نکتۂ نظر سے سوچا کہ کس طرح اپنے مٹھی بھر آدمیوں کو حملہ کے لئے اور مدافعت کے لئے متعین کرنا چاہیئے۔

مکان کے سامنے کی طرف ایک بڑا دالان تھا جس میں باہر کو نکلتا ہوا ایک منظرہ بنا ہوا تھا اور اس کی کھڑکیوں میں خوبصورت لکڑی کے کام کی جالیاں جڑی تھیں۔ ان کھڑکیوں کے نیچے ایک کشادہ چوک تھا جس کے آگے قلعہ تھا۔ قلعہ کا دروازہ مضبوط لوہے کی کیلوں سے بندھا تھا اور ایک اونچی دیوار میں لگا ہوا تھا۔ دیوار کے اوپر چوکی پہرہ تھا۔ اور ایک پہرہ دار گشت لگا رہا تھا۔ ابن سعود نے جب سب جانچ پڑتال کر لی تو یہ فیصلہ کیا کہ حاکم جس وقت صبح کو قلعہ سے برآمد ہو اسی وقت وہ اس پر جھپٹ پڑے اور مار دھاڑ

ادے، اسی انتشار میں قلعہ پر بھی قابو کرلے ۔

اس فیصلے کے بعد سب سے پہلے دو آدمی محمد اور اس کے ساتھ جو آدمی پیچھے چھوڑ دیئے تھے ان کو بلا لانے کے لیے بھیجے۔ جب یہ آگئے تو اس نے کچھ آدمی کھڑکیوں میں چوک اور قلعہ کی طرف نگاہ رکھنے کے لئے بٹھا دیئے۔ اور باقی آدمیوں کے ساتھ باقی رات کی گھڑیاں گزارنے کے لئے جو اب بھاری ہو چلی تھیں بیٹھ گیا فرش پر پالتی لگا کر۔ جب یہ سب حلیف، دوست اور بھائی بیٹھے تڑکا ہونے کا انتظار کر رہے تھے انہوں نے کسی کو قرآن شریف پڑھتے سنا۔ انہوں نے بھی علیحدہ علیحدہ اپنی دعائیں مانگیں اور ایک دوسرے کو سینے سے لگا کر اپنے قصوروں اور اپنی کوتاہیوں کی معافیاں مانگیں اور اس طرح ایک جان بن کر تھوڑی دیر کے لئے فرش پر ہی لیٹ کر سو گئے۔

جب تڑکا ہوا تو ملازم نہوہ، قلیجے اور کھجوریں لائے، انہوں نے اٹھ کر ناشتہ کیا پھر وضو کیا اور فجر کی نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ دو صفیں ان ایک جان اور تیس قالب مجاہدین کی جناب کبریا کے حضور میں نماز ادا کرنے کے لئے کھڑی ہوئیں۔ ابن سعود نے آگے بڑھ کر امامت کی، نماز ختم ہوئی تو انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور مسلح ہو کر اب جو کچھ بھی پیش آنے والا تھا اس کے لئے تیار ہو گئے۔

آفتاب کی ہلکی ہلکی کرنیں سب طرف پڑنے لگیں۔ رات کی خاموشی تو نماز کے وقت ہی ختم ہو گئی تھی۔ جب چاروں طرف سے اذان کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن اب کچھ آہٹ بھی زیادہ ہونے لگی تھی اور قلعہ کی طرف سے پہرہ دار بھی اپنا پہرہ پکار رہے تھے۔ ابن سعود کھڑکی کی طرف ہلکے سے قدموں سے چلا۔ اور احتیاط سے چوک اور قلعہ کی طرف نظر ڈالی۔ اس نے غلاموں کو چوک میں گھوڑے لے جاتے دیکھا اور قلعہ کی طرف سے نقل و حرکت ہوتی معلوم ہوئی اس نے جان لیا کہ اب قلعہ کا دروازہ کھلنے والا ہے اور اپنے آخری احکام سب کو دے دیئے۔ اس نے کہا کہ چار آدمی کھڑکیوں پر ٹھہریں اور جب وہ اس کو چوک میں دوڑتا ہوا دیکھیں اس وقت قلعہ کے محافظوں پر گولیاں برسائیں، باقی سب آدمی اس کے پیچھے رہیں، یہ حکم دے کر وہ محل کے دروازہ پر آ کر کھڑا ہوا اور قلعہ کے دروازہ کے کھلنے کا منتظر رہا۔ جیسے ہی دروازہ کے دونوں کواڑ کھلے اور عجلان اپنے مسلح حفاظتی دستہ کے ساتھ باہر نکلا اور گھوڑوں کو دیکھنے کو بڑھا۔ ابن سعود نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور آگے بڑھا۔ باہر کی چند سیڑھیوں سے اتر کر وہ دیوانہ وار چوک کی طرف دوڑا اور بلند آواز سے للکارتا ہوا سیدھا عجلان پر چلا۔ وہ آواز پر گھوما۔ اور اس نے اپنی تلوار نکال کر اس پر وار کیا۔ ابن سعود نے یہ وار اپنی رائفل کی نال سے رد کیا اور اس کو پھینک کر عجلان سے گتھم گتھا ہو گیا۔ دونوں لڑتے ہوئے زمین پر گرے۔ محافظ اور ابن سعود کے جانبازوں میں بھی تلواریں چلنے لگیں۔ محافظ منتشر ہوئے اور قلعہ کی طرف کو بھاگے۔ مگر عجلان بہت شجاعت سے لڑتا رہا اور پھر ابن سعود کے چنگل سے نکل کر قلعہ کے

دروازے کی طرف کو دوڑا اور دہاڑا۔ ایک محافظ نے ابن سعود پر تلوار کا وار کیا لیکن اس کو جلوی نے کاٹ ڈالا۔ ابن سعود نے عجلان کی رائفل چھین لی اور اس پر گولی ماری جس سے اس کے ہاتھ میں زخم کاری لگا۔ اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔ مگر وہ دوڑا اور دروازے تک پہنچ گیا۔ وہیں ابن سعود بھی اس پر لپکا اور اس کی ٹانگیں پکڑ لیں اور زور سے کھینچا، عجلان چوکھٹ سے ہٹ گیا۔ اندر سے پہرہ والے سپاہی دروازے کی طرف کو جھپٹے ادھر سے ابن سعود کے جانباز باہر سے دوڑے سیڑھیوں پر تلواریں چلنے لگیں۔ اب آدمیوں کا ایک غول تھا جس میں تلوار پر تلوار چل رہی تھی۔ وار پر وار ہو رہے تھے، نعروں پر نعرے لگ رہے تھے اور بہت شور و غل مچ رہا تھا۔ ادھر تو یوں گھمسان کی جنگ برپا تھی ادھر دیواروں کے اوپر سے اور ان کے روزنوں میں سے قلعہ میں سے فوجی دستہ گولیاں برسا رہا تھا اور جو نہتے تھے وہ پتھر پھینک رہے تھے۔ ابن سعود کے پاس ہی ایک جانباز کے گولی لگی اور وہ گرا اور ایک دوسرا تلوار سے زخمی ہو کر گرا اور تڑپنے لگا۔ عجلان کے محافظ پھر ریلا کیے آئے اور ابن سعود پر حملہ آور ہوئے جس سے عجلان ایک ٹانگ چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اسی ٹانگ سے ابن سعود کے زیر ناف لات ماری، اس کی ضرب ایسی لگی کہ وہ درد سے بے قابو ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے عجلان کی دوسری ٹانگ بھی چھوٹ گئی۔ اب محافظوں نے عجلان کو کھینچ کر دروازہ کے اندر کر لیا اور دروازہ کو بند کرنے کی کوشش کی۔ جلوی لڑتا ہوا اتنی جانبازوں کے ساتھ دروازہ پر آپڑا اور پھر سب نے ایسا ریلا کیا کہ وہ پورا کھل گیا اور حملہ آور قلعہ میں داخل ہو گئے عجلان مسجد کی طرف کو صحن کے پار دوڑتا چلا جا رہا تھا عجلان کے پیچھے ابن سعود جو اب سنبھل گیا تھا اور جلوی تلواریں کھینچے دوڑے، جلوی نے اس کو مسجد کی سیڑھیوں پر جا پکڑا اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ دیواروں پر سے جو فوجی دستے گولیاں چلا رہے تھے اب ان پر حملہ آور چڑھ دوڑے اور زینے کی طرف سے ان پر دھاوا مارا۔ ابن سعود کے دو آدمی مارے جا چکے تھے اور چار کے کاری زخم لگے تھے۔ اتنی کے مقابلہ میں یہ کل تیس تھے لیکن ان کے ساتھ فتح کی دھاک تھی۔ انہوں نے زینے پر کا دیوار کا راستہ جیت کر نصف سے زیادہ فوجی دستے کو ختم کر دیا بہت سوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا اور بہت سوں کو کاری زخم لگائے اور ان سب کو دیوار کے نیچے چوک میں پھینک دیا جہاں ان کی بوٹی بوٹی کر دی گئی باقی جو دستہ رہ گیا تھا وہ بھاگ کر ایک کمرے میں گھس گیا جس کا انہوں نے محاصرہ کر لیا۔

ابن سعود اور اس کے تیس جانباز دوست اور بھائی اب سارے قلعہ پر قابض ہو گئے۔ فوراً ہی ابن سعود نے شہر میں ہرکارے بھیج کر ان کو خبردار کر دیا کہ اس نے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس نے قلعہ کی دیوار پر اپنے جانباز سپاہی متعین کر دیئے۔ اور جامع مسجد شہر میں بھی اپنی کامیابی کی اطلاع پہنچا دی۔

ریاض کی آبادی میں اس کی فتح کی دھوم مچ گئی۔ لوگ چاروں طرف سے اٹھ کھڑے ہوئے، یہ رشید سے پہلے ہی تنگ آ چکے تھے اور اس کی ناانصافیوں سے بیزار تھے۔ انہوں نے شہر میں جو رشید کی فوجی چوکیاں تھیں ان پر حملے کر کے سب آدمیوں کو قتل کر دیا۔ قلعہ کا باقی دستہ بھی محکوم ہوا اور اس نے ہتھیار ڈال دیئے شہریوں نے ابن سعود کو کھلے ہاتھوں لیا اور وہ اب ریاض کا مالک تھا۔

نقد و نظر

"الیقظہ" طلبائے دارالعلوم دیوبند کا عربی ترجمان
سائز $\frac{۲۲\times۳۰}{۱۶}$ کتابت ٹائپ نما۔ حروف روشن۔ طباعت عمدہ۔ قیمت سالانہ دو روپے
مدیر:- عمید الزماں   مقامِ اشاعت۔ دفتر الہیئۃ العربیہ۔ دارالعلوم دیوبند

طلبائے دارالعلوم کے اس عربی ترجمان کا ابھی ایک سال قبل اجرا ہوا ہے۔ دارالعلوم سے ایسے کارآمد اور ہلکے پھلکے عربی جریدہ کی اشاعت وقت کے مطالبات کا بہترین جواب ہے بعض حلقوں میں اس جریدہ کی غیر معمولی مقبولیت اور کامیابی باعثِ حیرت بنی ہوئی ہے ہمارے نزدیک دارالعلوم سے کسی عربی اخبار یا رسالے کا شائع نہ ہونا باعثِ حیرت تھا۔ دارالعلوم کو عربی میں دینیات کا نصاب پڑھاتے ایک صدی گزر گئی مگر عربی زبان و ادب کے سلسلے میں ابھی چند سال قبل تک جس روش پر دارالعلوم گامزن تھا وہ علمی حلقوں میں ہمیشہ موضوع بحث رہی ہے۔ لیکن پچھلے ۴۔ ۵ برس سے فضا کا رخ کچھ بدلا ہے اور اس سلسلے میں کچھ ابتدائی اقدامات کئے گئے ہیں۔ جس کے باعث طلباً میں جدید عربی زبان کے سلسلے میں اک شعور جاگ اٹھا ہے۔ الیقظہ اسی شعور کی اک خوش آیند علامت ہے۔ اس وقت دارالعلوم کی فضا میں عربی زبان و ادب کی شمع ہمارے نزدیک زیادہ تر انہی طلبا کے گرم خون سے روشن ہے۔ الیقظہ نہ صرف اپنے مقاصد اور پس منظر کے لحاظ سے اک قابل قدر پرچہ ہے بلکہ اپنے مضامین اور ترتیب کے لحاظ سے فکر و ذہن کی اسلامی تربیت کا اک مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ اس کی زبان مقامی ماحول کے لحاظ سے ہلکی پھلکی اور طلبہ کے لئے معین و مفید ثابت ہوگی۔ ہمارے نزدیک اگر الیقظہ ہی کے ایک یا دو کالم میں جدید عربی زبان کے اسباق کا سلسلہ جاری کر دیا جائے تو یہ نہ صرف یہ کہ پڑھنے والوں کے لئے مفید ہوگا بلکہ اس سے قارئین کے حلقے میں بھی بہت کچھ اضافے کی توقع ہے۔ ہمارے خیال میں درسِ نظامی کے کم از کم درجۂ وسطیٰ کے طلباً کے لئے الیقظہ کا مطالعہ بہت مفید اور نہایت ضروری ہے۔

المتبلیغ سلسلۂ مواعظ حضرت تھانوی رح۔   ضخامت   قیمت
کتابت و طباعت غنیمت۔ ٹائٹل دو رنگا، سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$

دینی اہمیت کے سلسلے میں دیوبند سے کچھ ماہانہ پروگرام چل رہے ہیں۔ انہی میں ایک اور مفید پروگرام کا اضافہ ہوا ہے حضرت تھانوی رح کے دوسرے مواعظ و عواتِ عبدیت وغیرہ بھی ماہانہ پروگرام کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں

حضرت مولانا فخر الحسن صاحب استاد دار العلوم کی ــــ

رائے گرامی

عزیزم مولانا وحید الزماں صاحب سلمہٗ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ موقر رسالہ القاسم برابر میرے نام بھیجتے ہیں جس کا میں شکر گزار ہوں۔ اس کی توفیق بہت کم ہوئی ہے کہ میں اس کا مطالعہ کروں۔ ایک روز رسالہ القاسم کو ہاتھ میں لیا اور مختلف جگہ سے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ آخر میں میری نظر الدرس العربی پر پہنچی اور وہاں پہنچکر جم گئی۔ یوں تو ماشاء اللہ القاسم کے تمام ہی مضامین قابلِ تحسین ہیں اور علمی اور تاریخی بھی۔ لیکن یہ سلسلہ الدرس العربی کا جو آپ نے جاری فرمایا اس کو دیکھ کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی۔ میرا دیرینہ خیال تھا کہ عربی طلبہ کے لئے عربی جدید یا قدیم زبان سیکھنے کے لئے بہتر صورت یہ ہے کہ عربی جدید کے الفاظ کی تشریح اردو میں علیحدہ کی جائے پھر اس عربی کے جملوں کو اردو زبان کا اس طرح جامہ پہنایا جائے کہ بامحاورہ ہونے کے ساتھ وہ تحت اللفظ سے تجاوز نہ کرے۔ الحمد للہ کہ آپ نے میری دیرینہ آرزو کو پورا فرمایا۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ میں طلبہ دارالعلوم سے خصوصاً اور تمام طلبائے مدارس عربیہ سے عموماً خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا پاکستانی یہ گزارش کروں گا کہ ان کے لئے اس درسِ عربی کا پڑھنا از بس مفید اور ضروری ہے۔ اگر رسالہ میں ان دو صفحوں کے علاوہ اور کوئی دوسرا مفید مضمون نہ بھی ہو تب بھی یہ دو صفحے رسالہ کی قیمت کو وصول کرا دیتے ہیں بلکہ یہ دو صفحے اس معاوضہ میں ارزاں اور سستے ہیں۔

خدا کرے کہ آپ کا یہ رسالہ کامیاب ہو اور بالخصوص یہ درس طلبہ کے لئے مفید ثابت ہو۔ آمین۔

بقیہ نقد و نظر ــــ

لیکن ابھی تک سلسلۃ التبلیغ اس صورت میں شائع نہیں ہوا تھا۔ مکتبہ ضیاء العلوم نے اس خدمت کو اپنے ذمہ لیا ہے اس نمبر میں دو وعظ آگئے ہیں۔ جو وقت کے لحاظ سے بہت کارآمد اور مفید ثابت ہوں گے کہ ان میں جاہل پیروں اور گمراہ واعظین پر سخت تنقید ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت تھانوی رح نے جہاں عوام کی اصلاح فرمائی وہاں مدعیانِ علم و وارثانِ تصوف کے تزکیۂ کا نازک فریضہ بھی اپنے مخصوص طرز کی ساتھ انجام دیا ہے۔ اللہ حضرت تھانوی پر رحمت و غفران کی بارش برسائے کہ معاشرے کے ہر فرد کی اصلاح کا اک لائحۂ عمل تجویز فرما دیا۔ مکتبہ ضیاء العلوم کی یہ دینی خدمت قابلِ قدر ہے کہ اس طرز خدمت کو عام کیا جائے۔

امید ہے کہ حضرت تھانوی رح کے کام اور نام دونوں کی برکت سے عوام و خواص التبلیغ کے اس سلسلۂ اشاعت میں دلچسپی لیں گے۔

عالی

معلوماتِ عامہ

- قطب جنوبی کی حرارت بڑھ رہی ہے۔ لینن گراڈ۔ پچھلے سال موسم سرما میں انٹارکٹیکا میں درجۂ حرارت کبھی کبھی ۷۸ ڈگری سینٹی گریڈ سے نیچے نہیں گیا۔ سوویٹ اسٹیشن رستوک کے اسٹاف نے سوویت یونین کے آرکٹک اور انٹارکٹک سائنسی تحقیقاتی ادارے کو اطلاع دی ہے۔ یہ اسٹیشن قطب جنوبی پر واقع ہے اور اس اسٹیشن میں ۱۹۵۹ء میں دنیا کا سب سے کم درجۂ حرارت ریکارڈ کیا گیا تھا یعنی ۸۸٫۱ ڈگری سینٹی گریڈ۔ اسٹیشن کے قرب و جوار میں ۲۲ اگست سے آسمان بہت روشن ہو گیا ہے۔ ۳۱ اگست کو یعنی کیلنڈر کے اعتبار سے موسم سرما کی آخری تاریخ کو موسم غیر معمولی طور پر گرم رہا۔ یعنی صرف نفی ۶۰ ڈگری سینٹی گریڈ رہا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ قطب سرد کی حرارت میں اضافہ کا سبب وہ تبدیلیاں ہیں جو نظام شمسی کی رفتار میں کمی آنے کی وجہ سے انٹارکٹیکا کے علاقے میں فضائی گردش میں پیدا ہو گئی ہیں۔
- دنیا کی عظیم ترین دوربین جس کی جسامت ۱۸ منزلہ عمارت کے برابر ہے۔ اس کا وزن ۱۳۵ ٹن ہے۔ ۸ ستمبر۔ آسٹریلیا کی سب سے بڑی ریڈیائی دوربین جو پارکس (نیو ساؤتھ ویلز) میں تیار کی جا رہی ہے، عنقریب تیار ہو جائے گی۔ اس کا وزن ۱۳۵ ٹن ہو گا اور جسامت ۱۸ منزلہ عمارت کے برابر۔
- معلوم ہوا ہے کہ دنیائے طب میں ایک ایسا طریقہ ایجاد ہوا ہے۔ کہ نیویارک میں بیٹھا ہوا ڈاکٹر سان فرانسسکو کے مریض کی آسانی سے تشخیص کر سکے گا۔ اصل میں یہ ایک قسم کی برقی مشین ہے جو مریض کے دل کی حرکات کو پوری صحت کے ساتھ نشر کر سکتی ہے۔ اور اسے سن کر ماہرین طب مرض کی تشخیص کر سکتے ہیں۔ حال ہی میں نیویارک میں اس قسم کا تجربہ کیا گیا۔
- کولون (جرمنی)، یہاں ایک نئی عمارت بن رہی ہے جو ہوا میں گھاس کی طرح لہراتی ہے۔ یہ ۳۲ منزلہ عمارت ہو گی اور جرمنی میں سب سے اونچی عمارت ہو گی۔ یہ ہوا میں ضرور لہرائے گی مگر خطرناک طریقہ سے نہیں۔
- <u>شیشے کی بسیں</u>۔ انگلینڈ کی ایک بس بنانے والی فیکٹری ایک ایسا شیشہ تیار کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ جس سے بسوں کے ڈھانچے بنائے جا سکیں۔ اگر ایسی بسوں کی تیاری ہر طرح سے مفید ثابت ہو جائے تو ایسی ہی بسیں بنائی جائیں گی۔ کیونکہ ان کے چلنے میں آواز کم ہو گی۔
- لندن میں ماہرین نے عمارت کی بنیادیں کھودنے کیلئے ایک نیا آلہ ایجاد کیا ہے جو زمین میں ۲۵ میٹر کی گہرائی تک پہنچتا ہے عمارت کی بلندی اور وسعت کے لحاظ سے بنیاد کو چھوٹا بڑا بھی کیا جا سکتا ہے اور یہ ہر دوسرے آلہ سے تیز ہے کیونکہ یہ چار گھنٹہ میں بنیاد کھود دیتا ہے۔

القاموس الجدید

جدید اردو عربی ڈکشنری

مرتبہ : وحید الزماں کیرانوی ۔ فاضل دار العلوم دیوبند

خصوصیات نمبر ۱

• ۔ اردو الفاظ و محاورات حروف تہجی پر ترتیب دے کر ان کے بالمقابل عربی کے صحیح الفاظ و محاورات کی تشریح

• ۔ مفرد الفاظ کا طریقۂ استعمال افعال کے صلات و ابواب اسماء کی واحد اور جموع اور مختلف صفات کی وضاحت

خصوصیات نمبر ۲

• ۔ علمی، ادبی، صحافتی، سیاسی طبی، صنعتی اور دیگر بین الاقوامی اصطلاحات و تعبیرات کا بیش قیمت ذخیرہ ۔

• ۔ اس سے ترجمہ نگار اور انشاپرداز بھی رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں ۔

……« مجلات و جرائد کے آئینے میں »……

صدق جدید ۔ لکھنؤ ۔ ۶ مئی ۱۹۶۰ء

اب تک اس موضوع پر جو کتابیں موجود ہیں ان سب سے بہتر مفصل تر اور جامع ۔

برہان ۔ دہلی ۔ فروری ۱۹۶۰ء

کتاب کے مفید ہونے میں شبہ نہیں ، عربی اخبارات و رسائل اور لغات جدیدہ رسائل میں جو کتابیں مصر و ہند میں شائع ہوئی ہیں ان کی مدد سے کوشش کی گئی ہے کہ انگریزی کے جو الفاظ اردو میں رچ بس گئے ہیں ان کا بھی استقصا کر لیا جائے ۔ طلبہ اور اساتذۂ مدارس کو فائدہ اٹھانا چاہیے ۔

دعوت ۔ دہلی ۔ یکم فروری ۱۹۶۰ء

ضرورت ہے کہ ہمارے پاس ایسی کتابیں ہوں جن کی مدد سے ہم موجودہ ادب سے بھی بہرہ ور ہو سکیں ..... المنجد یا اس کے ترجموں سے یہ مطالب پورا نہیں ہوتا ..... اس سلسلہ میں القاموس الجدید مؤلفہ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی بہتر مواد فراہم کرتی ہے ۔ الفاظ کا اچھا خاصا ذخیرہ موصوف نے یکجا کر دیا ہے ۔

دار العلوم دیوبند ۔ دسمبر ۱۹۶۰ء

بلاشبہ یہ ڈکشنری اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اپنے طرز کی پہلی اور جامع تالیف ہے ۔

تجلّی ۔ دیوبند ۔ دسمبر ۱۹۶۰ء ۔ یہ اردو عربی لغت وقت کی ایک اہم ضرورت کو خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرتے ہوئے سامنے آئی ہے ۔ داد کے قابل ہے ۔ مرتب کی کنج کاوی ۔ محنت اور تلاش و تحقیق ۔

المطالعۃ المحمودۃ (از وحید الزماں کیرانوی فاضل دیوبند) عربی نصاب کی چند مفید ترین کڑیاں ۔ جو تعلیمی تجربات کے مراحل کو کامیابی کے ساتھ گزر چکی ہیں ۔ کتابوں کی ترتیب نہایت بامقصد و دل آویز اور مفید و نصیحت آمیز ہے جس سے نہ صرف یہ کہ نو آموز طلبہ کے لئے جدید عربی ادب کی ابتدائی راہیں ہموار ہوتی ہیں بلکہ ان کے دل و دماغ کے سادہ اوراق پر دینی معلومات اور اسلامی معاشرت کے پاکیزہ نقوش بھی ثبت ہو جاتے ہیں ۔ قیمت مبادی ۸/ جزء اول ۱۲/ جزء ثانی ۱۲/

ہر قسم کی کتابیں منگانے کے لئے لکھئے : **مکتبہ القاسم ۔ دار الفکر ۔ دیوبند ۔ (یو ۔ پی)**

درسِ عربی (۳)

اقسامِ فعل بلحاظِ زمانہ ——— ماضی ——— مضارع ——— امر

فِعلِ مَاضِی

امثلہ ——— :

(۱) خَلَقَ اللّٰہُ — خدا نے پیدا کیا
(۲) رَزَقَ اللّٰہُ — خدا نے رزق دیا
(۳) اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ — خدا کے پیغمبر نے حکم دیا
(۴) جَاءَ جِبْرِیْلُ — حضرت جبریل آئے (آیا)
(۵) نَزَلَ الْقُرْاٰنُ — قرآن کریم نازل ہوا
(۶) اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ — قیامت قریب آگئی
(۷) قَامَتِ الصَّلٰوۃُ — نماز (کھڑی) شروع ہوگئی
(۸) مَرِضَ الصَّبِیُّ — بچہ بیمار ہوا
(۹) رَکِبَ اِبْرَاھِیْمُ — ابراہیم سوار ہوا
(۱۰) کَتَبَ التِّلْمِیْذُ — شاگرد نے لکھا
(۱۱) قَرَأَ الطَّالِبُ — طالب علم نے پڑھا
(۱۲) ذَھَبَ الرَّجُلُ — مرد گیا
(۱۳) جَلَسَتِ الْبِنْتُ — لڑکی بیٹھی
(۱۴) فَرِحَتِ الْاُمُّ — ماں خوش ہوئی

قاعدہ :- فعل ماضی ——— وہ فعل ہے جو گذرے ہوئے (بولنے کے وقت سے پہلے) زمانہ میں کسی کام کے ہونے یا کرنے کو بتائے جیسا کہ اوپر کی مثالوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے ۔

فائدہ ـ ہر زبان میں فعل کی بہت سی شکلیں ——— ہوتی ہیں کسی میں کم کسی میں زیادہ ۔ عربی میں چودہ شکلیں ہیں یعنی چودہ قسم کے فاعل ہیں جن سے فعل صادر ہوتا ہے ۔ ان چودہ شکلوں کی تفصیل حسب ذیل ہے :

غائب (۶)
(۱) واحد مذکر — (۲) واحد مؤنث — (۳) تثنیہ مذکر — (۴) تثنیہ مؤنث — (۵) جمع مذکر — (۶) جمع مؤنث

حاضر (۶)
(۷) واحد مذکر — (۸) واحد مؤنث — (۹) تثنیہ مذکر — (۱۰) تثنیہ مؤنث — (۱۱) جمع مذکر — (۱۲) جمع مؤنث

متکلم (۲)
(۱۳) واحد ـ مذکر و مؤنث — (۱۴) جمع ـ مذکر و مؤنث

فائدہ[۲] :- اوپر کی مثالوں میں فعلِ ماضی کی پہلی شکل ہے جو واحد مذکر غائب کے لئے ہے بقیہ تمام شکلیں اسی پہلی شکل سے کچھ علامات بڑھا کر بنائی جاتی ہیں ۔ یہ علامات حسب ذیل نقشے سے سمجھی جائیں

شکل اول رَکِبَ	واحد مذکر غائب		تثنیہ مذکر غائب		جمع مذکر غائب		واحد مؤنث غائب		تثنیہ مؤنث غائب		جمع مؤنث غائب	
	علامت	مثال	علامت	مثال	علامت	مثال	علامت	مثال	علامت	مثال	علامت	مثال
	·	رَکِبَ	ا	رَکِبَا	وْا	رَکِبُوْا	تْ	رَکِبَتْ	تَا	رَکِبَتَا	نَ	رَکِبْنَ
	واحد مذکر حاضر		تثنیہ مذکر حاضر		جمع مذکر حاضر		واحد مؤنث حاضر		تثنیہ مؤنث حاضر		جمع مؤنث حاضر	
	تَ	رَکِبْتَ	تُمَا	رَکِبْتُمَا	تُمْ	رَکِبْتُمْ	تِ	رَکِبْتِ	تُمَا	رَکِبْتُمَا	تُنَّ	رَکِبْتُنَّ
	واحد متکلم		جمع متکلم		ہر		ہر		ہر		ہر	
	تُ	رَکِبْتُ	نَا	رَکِبْنَا		ہر		ہر		ہر		ہر

نوٹ : شکل اول (صیغہ واحد مذکر غائب) کے آخری حرف پر فتحہ ہوتا ہے یہ فتحہ چار شکلوں (صیغوں) یعنی واحد مذکر غائب ، تثنیہ مذکر غائب ، واحد مؤنث غائب ، تثنیہ مؤنث غائب میں بدستور رہتا ہے اور بقیہ دس صیغے بناتے وقت یہ فتحہ ضمہ (پیش) یا جزم (سکون) سے بدل جاتا ہے ۔ جمع مذکر غائب میں فتحہ کی بجائے ضمہ اور بقیہ نو صیغوں میں فتحہ کی بجائے جزم آجاتا ہے ۔

الدرس العربي

من صحافة اليوم

جولة في الفضاء

ابتعد الصاروخ الذي يقلنا الآن عن الأرض واقترب كثيرا من القمر.
يبدو سطح الأرض عكرا غير واضح.
إذ نبصره من خلال طبقة كثيفة من الهواء ومن التراب والضباب والسحب وشيء من المطر والثلج هنا وهناك.
والقمر هو أقرب جيراننا من النجوم إذ لا يبعد عن الأرض سوى ... ۲۳۹ ميل فقط.
ويظل هذا البعد ثابتا على الدوام
ولكن اتجاه القمر هو الذي يتغير باستمرار
إذ أنه ليس ساكنا في مكانه، بل يسير حول الأرض في دائرة.
وتربطه بالأرض دواما قوة الجاذبية.
ويبدو القمر أكبر الأجرام في السماء غير الشمس — والحقيقة أنه من أصغرها وإنما يبدو كبيرا لقربه منا فإن قطره لا يتجاوز ۲۱٦۰ ميلا — أي أنه أكبر قليلا من ربع قطر الأرض.

خلا کی سیر

جو راکٹ ہمیں لئے جارہا ہے وہ اب زمین سے دور۔ اور چاند سے بہت نزدیک ہو گیا ہے۔
زمین کی سطح دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہے۔
کیونکہ ہم اسے ہوا کی موٹی تہ، مٹی، کہر، بادلوں، کچھ بارش اور ادھر ادھر (پھیلے ہوئے) برف کے اندر سے دیکھتے ہیں
چاند (اور) ستاروں کے مقابلہ میں ہم سے زیادہ قریب ہے اسلئے کہ وہ زمین سے صرف دو لاکھ انتالیس ہزار میل دور ہے۔
اور یہ بُعد ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔
لیکن چاند کا رخ برابر بدلتا رہتا ہے
کیونکہ وہ اپنی جگہ قائم نہیں ہے بلکہ ایک دائرہ کے اندر زمین کے ارد گرد حرکت کرتا رہتا ہے۔
(قوت جاذبہ) کشش اسے دائمی طور پر زمین سے وابستہ رکھتی ہے۔
آفتاب کے علاوہ چاند سب اجرام سماویہ میں بڑا دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ فی الواقع وہ ان سب سے چھوٹا ہے۔
وہ ہمیں بڑا تو صرف اسلئے دکھائی دیتا ہے کہ ہم سے قریب ہے کیونکہ اس کا قطر دو ہزار ایک سو ساٹھ میل سے زیادہ نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین کے چوتھائی قطر سے کچھ ہی بڑا ہے۔

الصاروخ: راکٹ ؛ جولة: گشت، سیر ؛ اقلال: منتقل کرنا، لے چلنا ؛ اتجاه: رخ۔

ماہنامہ

القاسم

دیوبند

2(3)

دارالفکر دیوبند (یوپی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

القاسم

ماهنامہ

دیوبند

شمارہ ۳
جلد ۲

سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ ۴۰ پیسے

مدیر مسئول
وحید الزمان کیرانوی
(فاضل دیوبند)

معاون
ابو الحسن بارہ بنکوی
(فاضل دیوبند)

مؤسسہ [illegible] مظاہری القاسمی

دسمبر سنہ ۱۹۶۱ء مطابق رجب المرجب سنہ ۱۳۸۱ھ

ترتیب مضامین

ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر وحید الزماں قاسمی نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند میں چھپوا کر دفتر القاسم دار الفکر دیوبند سے شائع کیا

اسلامی علوم کا نیا کارواں

یہ بات مسلم ہے کہ ساتویں صدی ہجری کے بعد سے اسلامی علوم و فنون کا سورج گہنا گیا ہے۔ وہ کاروانِ علم جو پہلی صدی ہجری سے فکر و نظر کی تازہ دم تونوں کے ساتھ چلا تھا اپنے سفر کی ہزارویں سالگرہ منا نے سے پہلے منتشر ہو گیا۔ ساتویں صدی کے بعد سے علم کی انجمن میں گنے چنے چہرے نظر آتے ہیں۔ اور ان میں بھی بیشتر افراد وہ ہیں جنھوں نے پہلوں کے سرمایۂ علم کو سمیٹ دیا ہے۔ اس پر کوئی اہم اضافہ نہیں کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعد کی صدیوں میں فکر و نظر کا سرمایا ہی باقی نہ رہا تھا۔ اس دور میں بھی سیوطی جیسا کثیر المطالعہ، ابن حجر جیسا صاحب تحقیق جامی جیسا اہل عرفان، ملا علی قاری جیسا فقیہ، شعرانی جیسا صاحب نظر، مجدد الف ثانی جیسا فرد فرید، شیخ عبد الحق جیسا محدث، علامہ سندھی جیسا باخبر، آزاد بلگرامی جیسا ادیب، مرتضیٰ زبیدی جیسا علامہ، طاہر پٹنی جیسا علم دوست، اور خاندانِ ولی اللہی جیسے مردانِ کار نے علم کے ورثے کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ ان میں بہت سوں نے اپنا خون جگر دے کر اس ورثے کو آب و تاب بھی بخشی ہے۔ انہی کی محنتوں کا ثمرہ اور انہی کی زندگیوں کا حاصل آج اسلامی علوم کی شکل میں ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن جس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لئے ہم مجبور ہیں وہ یہ کہ بالعموم ان بزرگوں کی جہد و سعی بعض وجوہ سے دفاعی حیثیت سے آگے بڑھ کر اقدامی شکل اختیار نہ کر سکی۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ ماحول کے تغیرات نے اور کچھ اسلامی یکجہتی کے اضمحلال نے علم کے ان ولولوں کو سرد کر دیا جو صدیوں تک فکر و نظر کی وادیوں میں تیز گام رہے ہے۔ اجتماعی زندگی کا رخ اتنا بدل گیا کہ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ دینی مشاغل کی تکمیل دشوار ہو گئی۔ ساتویں صدی کے بعد اسلامی خطے اسلام کی دعوتی اور تبلیغی حیثیتوں کو فراموش کر کے ان گروہوں اور قوموں کے رنگ میں رنگے گئے جو صرف اپنے عقائد اور اپنی قومی رسوم کی بنیاد پر ایک دوسرے سے جذباتی لگاؤ رکھتی ہیں جن کے بل وہ اجتماعی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں۔ اور ان کا مدعا صرف زندہ رہنا ہوتا ہے۔ غیر ارادی طور پر مسلمان قومیں اسی قناعت طلب زندگی کی خوگر بن گئیں۔ یہ وہ جرثومہ تھا جس نے مسلمانوں کو ایک طرف رہنمایانہ سیاست و اقتدار سے محروم کر دیا اور دوسری طرف ان کی فکری و نظری صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔

چنانچہ آج نگاہوں نے جہاں یہ حسرتناک منظر دیکھا کہ طبیعیاتی علوم پر دانشِ فرنگ دروبست قابض ہے اور مسلمان سانس لینے کے لئے بھی فرنگ کی پیدا کردہ فضا مستعار لینے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح یہ عبرتناک حادثہ

ی سامنے آیا کہ خالص دینی علوم کی تحقیق وتشریح کے لئے بھی لندن، ایڈن اور برلن کی دانش گاہیں مخصوص ہو گئیں۔ اور ہم خود اپنے اسلاف کے نوادر پاروں سے استفادہ کرنے کے لئے یورپ کی لائبریریوں کے منون ہیں۔

یہ انقلاب، علم کے زوال و انحطاط کی علامت نہیں تو اور کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضؓ کا ارشاد ہے:۔

وَاَنَّ اَهْلَ الْعِلْمِ صَانُوا الْعِلْمَ وَوَضَعُوْهُ عِنْدَ اَهْلِهٖ لَسَادُوْا بِهٖ اَهْلَ زَمَانِهِمْ۔ الخ (مشکوٰۃ)

اگر اہل علم، علم کی حفاظت کریں اور یہ امانت علم کے قدر دانوں کے سپرد کریں تو بلاشبہ اپنے وقت کے رہنما بن جائیں۔ الخ

مسلمانوں کی موجودہ پستی، ان کی بے بسی و کمزوری اور ان کی بے وقعتی کے اسباب کا کھوج اس کی روشنی میں لگایا جاسکتا ہے ۔ وہ ارباب فکر و نظر جنھیں حالات کی تہہ میں اترنے اور مسلمانوں کی اجتماعی پریشان حالی کے اسباب وعلل تک پہنچنے کی توفیق ہو۔ اس دور میں امت کے سب سے بڑے محسن ہیں۔ پھر اگر وہ اس بصیرت و سعادت سے بھی بہرہ مند ہوں کہ تشخیص کے بعد کوئی کارگر بنیادی تجویز بھی پیش کرسکیں تو واقعہ یہ ہے کہ وہی امت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کے علمبردار ہوں گے۔ اور جن بابرکت ہاتھوں میں ان تجاویز کو بروئے کار لانے کے ذرائع و وسائل ہوں اور انھیں ان سے کام لینے کی توفیق بھی میسر آجائے تو یہ ان پر اللہ کا ایک فضل عظیم ہے۔ یہ بات تو کسی تفصیلی بحث کی محتاج نہیں کہ امت عوام و خواص کے دو طبقوں پر مشتمل ہے عوام کی تربیت و اصلاح کے لئے حرکت وعمل کے کسی ایسے نفسیاتی پروگرام کی ضرورت ہے جو ان کے اصل عقائد کو تازہ اور قوت عمل کو زندہ کردے۔ اللہ کا شکر ہے کہ عوامی بیداری کی یہ لہر امت میں اب پھیلتی جارہی ہے۔ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں اس نہج پر کچھ نہ کچھ کام شروع ہو گیا ہے۔ مگر خواص جس طرز تربیت کے محتاج ہیں جن پر سماجی زندگی کے ڈھلنے کا دار و مدار ہے، وہ ابھی تک کہیں اس طرح سامنے نہیں آیا کہ اس کوشش نظر رکھ کر ہر علاقہ اور ہر خطے کے مسلمان نئی نئی زندگی کی تشکیل کا سرو سامان کرسکیں۔

اس سلسلہ میں چند ماہ قبل یہ سامعہ نواز خبر آئی کہ حجاز کے فرماں روا مہبط وحی اور مدفن رسول کے جوار میں اسی نقطۂ نظر سے اسلامی علوم کی ایک مرکزی یونیورسٹی قائم کر رہے ہیں۔ طائر فکر نے اس مسرت افروز خبر کو اتحاد اسلامی جیسے دلکش خوابوں میں اک حسین خواب کا اضافہ سمجھا اور اسے خیالی فضاؤں میں لے اڑا۔ کچھ لوگوں نے اس تجویز کو سیاسی آویزشوں کی پرچھائیں تصور کیا تو بعض یاران شاطر نے اسے ملوکیت کے جال میں اک نئی گرہ قرار دیا۔ البتہ اہل نظر پردہ اٹھنے کے منتظر تھے۔ لیکن تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اس سلسلے میں علمی پیش رفت کی روداد سامنے آتی رہی جس سے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی محض شاہی منصوبہ نہیں جس کے نقش ونگار کو کاغذ پر منتقل ہونے کے لئے برس درکار ہوتے ہیں۔ بلکہ مرد مومن کا عزم ہے جو ملوکیت کے نقاب میں ہونے

کے باوجود ایمان ویقین کے نور سے منور ہے۔

اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے والیٔ حجاز نے اپنی دانست میں جن جن شخصیتوں کے فکری وعملی تعاون کی ضرورت محسوس کی، انھیں اس سلسلے میں مدعو بھی کیا ہمارے لئے یہ بات قابلِ مسرت ہے کہ ایک ہندوستانی مفکر وعالم کو بھی اس عظیم منصوبے کی تکمیل کے سلسلہ میں دعوت دی گئی تھی۔ اور اب تو یونیورسٹی تیزی کے ساتھ علمی مراحل طے کر رہی ہے۔

ہماری دلی خواہش ہے کہ مدینہ یونیورسٹی صحیح معنی میں ایک مرکزی اسلامی یونیورسٹی ثابت ہو، وہاں صرف اسلامی علوم وفنون ہی کی تعلیم وتدریس کا نظم ہو، بلکہ وہ ان کی تجدید وتاسیس کے لئے بھی پہل کرے، وہ صدیوں کے اس فاصلے کو اپنے عزم وعمل سے سمیٹ دے جو زوال وانحطاط کی بدولت اسلامی علوم کے سفر میں پیدا ہو گیا ہے۔ وہاں علوم کی تدوین اس نہج سے کی جائے کہ یونیورسٹی اسلامی علوم کے لئے میرِ کارواں اور دینی زندگی کے لئے پیغامِ نشاط بن جائے۔

اگرچہ مدینہ یونیورسٹی کا جو تعلیمی خاکہ اس وقت سامنے آیا ہے وہ تعمیر وارتقا کی ان بلندیوں تک پہنچنے کے لئے زادِ راہ نہیں بن سکتا جن تک پہنچنے کے لئے اک نئی اور انقلابی یونیورسٹی کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ تاہم ایک ابتدائی قدم اس طرح کے بلند عزائم کے ساتھ اٹھنا ہی غنیمت ہے۔ امت کی نشاۃِ ثانیہ اور علومِ اسلامی کی تجدید کے لئے جس طرح کے مردانِ کار اور جس طرح کے نصابِ تعلیم کی ضرورت ہے، یہ ایک الگ بحث ہے جس پر کسی دوسری صحبت میں گفتگو ہوگی۔ بہرحال ہم مدینہ یونیورسٹی کا اسلامی علوم کے ایک نئے کارواں کی حیثیت سے عظیم توقعات کے ساتھ استقبال کرتے ہیں۔

ارشادِ نبوی

قرض کی ادائیگی

مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ یُرِیْدُ اَدَائَهَا اَدَّاهَا اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ اَخَذَهَا یُرِیْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ۔ (بخاری روایت ابی ہریرہ رضؓ)

ابی ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص بطور قرض لوگوں کا مال لے اور اس کی نیت ادا کرنے کی ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے وہ قرض ادا کرا دیتے ہیں۔ اور جو شخص لوگوں کا مال ضائع کرنے کی نیت سے لے تو خدا اسے برباد کر دیتا ہے۔

انسان ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا، اسی لئے خدا نے باہمی تعاون کو ضروری قرار دیا ہے۔ تعاون کی متعدد صورتوں میں سے ایک صورت قرض کی بھی ہے۔ زندگی میں ہر انسان پر ایسا وقت آسکتا ہے اور آتا ہے کہ وہ اپنا کام چلانے اور پیش آمدہ مشکلات پر قابو پانے کے لئے دوسروں سے قرض لینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے لیکن یہی قرض جہاں زندگی کی مشکلات دفعہ کرتا اور نازک موقعوں پر انسان کی شرف و عزت کی حفاظت کا ذریعہ بنتا ہے تو ساتھ ہی فتنہ و فساد اور ذلت و رسوائی کا موجب بھی ہو جاتا ہے۔ اسلام قرض کے لین دین میں فریقین سے جس جذبۂ اخلاص کا مطالبہ کرتا ہے اگر وہ موجود ہو تو بلاشبہ قرض تعاونِ باہمی کی ایک بہترین شکل ہے ورنہ اگر کسی ایک فریق میں بھی جذبۂ تعاون کے بجائے کوئی دوسرا غلط جذبہ کارفرما ہے تو یہ قرض ہمدردی اور تعاون کے بجائے انقطاعِ تعلق اور فتنہ و فساد کا موجب ہو جاتا ہے۔

مذکورہ حدیث میں قرض لینے والے کا ذکر ہے کہ اگر کسی مسلمان کو اپنی ضرورت کے لئے قرض لینے کی نوبت آ جائے تو وہ قرض لے سکتا ہے مگر اس کا فرض ہے کہ قرض لیتے وقت اس کی نیت ادائیگی کی ہو اور صرف نیت ہی نہیں بلکہ وہ حتی المقدور اس کی ادائیگی کے لئے کوشاں بھی رہے تو ایسا شخص اگر کسی وجہ سے باوجود کوشش کے قرض ادا بھی نہ کر سکے تو خدا اس کا قرض ادا کرا دے گا۔ اس کے مطلب دو ہیں ایک یہ کہ خدا اپنی قدرت سے اس کے لئے ایسے اسباب بھی پیدا کر دے گا جن کے ذریعہ اس کا قرض ادا ہو جائے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ آخرت میں اس سے اس قرض کا مواخذہ نہ کیا جائے گا۔ اس کی جانب سے ادائیگی کی کوشش ہی کو بمنزلہ ادائیگی سمجھا جائیگا

اس حدیث میں ایسے شخص کے لئے وعید ہے کہ جو قرض لے کر ادائیگی کی نیت نہ کرے اور نہ ادا کرنے کیلئے کوشاں ہو۔ ایسا شخص دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو گا۔ اس سلسلہ میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے حکم برابر ہے۔

ع - ق

عہدِ نبوت میں
مساوات کے عملی نمونے

ایک دفعہ مجلس میں نبی کریم صلّے اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب ایک اعرابی (دیہاتی) بیٹھا ہوا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر صحابہ تشریف فرما تھے۔ حضورؐ کے سامنے دودھ آیا۔ آپ نوش فرما چکے تو حضرت عمرؓ کا منشا تھا کہ بقیہ دودھ حضرت ابوبکرؓ کو عنایت ہو مگر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، پہلے داہنی جانب والے کا حق ہے اور بچا ہوا دودھ اعرابی کو عنایت فرمایا۔

حضرت سعد بن وقاصؓ اپنے قبیلہ کے سردار اور مالدار تھے، وہ شانِ امیری کی وجہ سے اپنے آپ کو غریبوں سے کچھ اونچا تصور کرتے تھے۔ حضور نے فرمایا (کس خیال میں ہو) یہی غریب تو ہیں جن کی بدولت تم رئیس ہو اور کھاتے پیتے ہو۔

○

ایک صحابی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ غربار اور مہاجرین حلقہ بنائے بیٹھے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اس حلقے میں شامل ہو گئے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا حضورؐ نے غریب مہاجرین کو خوش خبری سنائی کہ وہ مالداروں سے پہلے جنت میں جائیں گے، کتنے دن پہلے جائیں گے؛ اس کی تعیین میں متعدد روایتیں ہیں۔ صحیح مسلم میں عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے:
ان فقراء المهاجرين يسبقون الاغنياء يوم القيامة الى الجنة باربعين خريفاً۔ ترجمہ:۔ یعنی فقراء مہاجرین اغنیاء سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔

بہرحال بارگاہِ نبوت میں امیر و غریب اور آزاد و غلام سب یکساں تھے۔ حضرت بلالؓ، حضرت صہیب رومی، حضرت سلمان فارسی رضوان اللہ علیہم جو غلام تھے۔ ان کا مرتبہ امراء اور رؤسا سے کم نہ تھا ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت بلالؓ اور حضرت سلمانؓ فارسی کو کوئی سخت اور ناگوار بات کہہ دی اس کی خبر جب بارگاہِ نبوت میں پہنچی تو آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کیا (اگر) ان کو ناراض کیا تو (گویا) حق تعالےٰ کو ناراض کیا۔ یہ سن کر حضرت صدیق اکبرؓ نے فوراً ان سے معافی چاہی

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم غزوۂ موتہ کے لئے تین ہزار صحابہ کو روانہ کرتے ہیں اور ان کا سردار حضرت زیدؓ بن حارث کو فرماتے ہیں۔ یہ وہی زید ہیں جنھیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے آزاد کرکے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا ـــ پھر ایک سریہ میں ان کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید کو جن کی عمر اس وقت انیس۱۹ سال کی تھی، ایک لشکر کی سرداری مرحمت فرمائی۔ (یہ وہ لشکر تھا جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر فاروق رضؓ جیسے جلیل القدر، تجربہ کار اور جہاں دیدہ صحابہ تھے۔ ان حضرات نے تفوق اور برتری کے تمام مقتضیات کو پس پشت ڈال دیا)۔

بنی مخزوم قریش کا اعلیٰ اور دولت مند قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کی ایک عورت نے جس کا نام فاطمہ تھا چوری کی جب آپ کو اس کی اطلاع پہنچی تو اس عورت کی دولت و وجاہت اور خاندانی علو و سیادت کا کوئی خیال نہیں کیا فوراً حد سرقہ یعنی ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا۔ اس کے قبیلے والوں کو ایک طرف اس عورت سے ایسے قبیح فعل کے باعث عار و ننگ تھا تو دوسری طرف قطع ید سے ایسا دھبہ لگنے کا اندیشہ تھا جو کبھی مٹائے نہ مٹتا۔ اسی بنا پر قریش نے صحابہ سے عرض کیا کہ اس مجرمہ کی امتیازی شان کی وجہ سے امتیازی سلوک کیا جائے تو بہتر ہے بعض صحابہ نے اس بات پر توجہ دی لیکن کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ یہ درخواست دربارِ رسالت میں پیش کرے بالآخر اس معاملہ میں حضرت اسامہؓ کو سفارش کے لئے منتخب کیا گیا۔ عام خیال تھا کہ چونکہ رحمت عالم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے خاص انس و محبت ہے اس لئے توقع ہے کہ ان کی سفارش پر ملزمہ کی رعایت فرمائیں گے۔ لیکن بجائے اس کے کہ حضور پر نور کے قلب مبارک میں حضرت اسامہ کی محبت بھری سفارش اپنا کام کرتی اور محبت پر عدل و انصاف کو قربان کرادیتی۔ سفارش سنتے ہی چہرۂ مبارک غصہ سے تمتمانے لگا، نہایت برہمی سے ارشاد فرمایا۔ اتشفع فی حد من حدود اللہ۔ (یعنی کیا تم خدا کی حدود میں سفارش کرتے ہو) آپ نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ صحابہ کرام کو جمع کرکے خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا :-

"اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ ان میں جب کوئی شریف اعلیٰ مرتبہ کا چوری جیسے جرم کا مرتکب ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے (یا خاص رعایت کرتے تھے) لیکن اگر کمزور اور معمولی درجہ کا آدمی مرتکب ہوتا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتے تھے۔ میں خدا کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ (یہ تو فاطمہ مخزومیہ کا معاملہ ہے) اگر فاطمہ بنت محمد (حضور کی صاحبزادی) بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا (خدا کی پناہ)"

یہ واقعہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے غیر معمولی محبت تھی۔ اس کے باوجود معاشرتی اور شرعی معاملات میں امتیازی شان ناپسند فرماتے تھے۔ اس کا اندازہ کرانے کے لئے

ضمناً یہ واقعہ ذکر کردینا مناسب ہے کہ حضرت فاطمہؓ بنت محمدؐ کو گھر کا تمام کام کاج خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی۔ ایک روز حضرت علیؓ کے ذریعہ ایک خادمہ کے لئے اباجان کی خدمت میں درخواست کی۔ اگر حضور کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید محبت پدری کے جوش میں اپنی چہیتی صاحبزادی کی تکلیف کا خیال کرتا اور فوراً کسی خادمہ کا انتظام کرتا مگر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صُفّہ والوں کا انتظام مقدم ہے ان لوگوں کے انتظام سے پہلے تمہارا کام نہیں کیا جاسکتا۔

○

جنگِ بدر کے اسیروں میں حضرت عباس (نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا) بھی تھے۔ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ سب قتل کردیئے جائیں۔ مگر صدیق اکبرؓ کی یہ رائے تھی کہ فدیہ یعنی وہ رقم جو جان کے عوض دی جائے اسے کر چھوڑ دیئے جائیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی تجویز کو پسند فرمایا۔ جب کافر اپنے قیدی فدیہ دے کر چھڑا رہے تھے تو بعض صحابہ نے حضرت عباس کو (حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا ہونے کی وجہ سے) بغیر فدیہ کے چھوڑنا چاہا۔ مگر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ امتیاز پسند نہ آیا اور فرمایا کہ ایک درہم بھی معاف نہ کیا جائے۔

ایک طرف مساوات کا اس قدر لحاظ — دوسری طرف ہمدردی اور رحمدلی کا یہ حال کہ لوگوں نے حضرت عباس کے ہاتھ اور پیر باندھ دیئے تھے۔ وہ اس بندش کی تکلیف سے کراہ رہے تھے۔ ان کی اس بے چینی کی آواز سے حضور کو نیند نہیں آتی تھی، مزاج شناس صحابہ آپ کی حالت کو سمجھ گئے اور چاہا کہ صرف حضرت عباس کی بندش کو ڈھیلی کردیں۔ حضور نے اس مخصوص معاملہ کو پسند نہ فرمایا۔ اور حکم دیا کہ دوسرے قیدیوں کی گرہیں بھی ڈھیلی کردی جائیں۔

○

سواد بن عمر کا بیان ہے کہ میں ایک دن حضور پرنور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درس کا رنگین کپڑا پہن کر گیا۔ آپ نے حط حط فرمایا۔ اور میرے پیٹ میں چھڑی سے چونکا بھی دیا۔ اس پر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو قصاص لوں گا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فوراً اپنا شکم مبارک میرے سامنے کردیا۔

یہ ہیں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کی چند شاندار مثالیں ؎

"مشتے نمونہ از خروارے"

سن ہجری کی سرگزشت

عالی

سن ہجری کا سفر عملاً نورِ رحمۃ اللعالمین محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی حیات میں شروع ہو گیا تھا۔ مگر اس کا ذہنی خاکہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں تیار ہوا۔ اس سن کا افتتاح ایک نئے انقلاب کا عنوان اور ایک نئی تہذیب کا سنگِ بنیاد بنا۔ وہ ایک نئے تمدن کا شاداب تخم تھا جسے مکے نے اپنے کلیجے سے نکال کر یثرب کے سینے میں بو دیا تھا۔ اسی تخم کے برگ و بار سے اسلامی تہذیب کی چھاؤں پھیلی۔

خاندانِ رسالت کے گل سرسبد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دقت نظری، جوہر شناسی اور حقیقت فہمی کی داد دینے کے لئے امتِ مرحومہ کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ جنہوں نے خلیفۂ دوم کی مجلسِ مشاورت میں اسلامی زندگی کے فاصلوں کو ناپنے کے لئے ہجرت کا پیمانہ تجویز کیا۔ شاید انسانی عقل و خرد اسلامی زندگی کے قیام و بقاء اور اس کے مزاج و قوام کے پیشِ نظر اسلامی معاشرہ کے نشو و نما اور طول و عرض کو سمجھنے کے لئے ہجرت سے بڑھ کر کوئی معیار سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔

تاریخ کے یہ دریچے اس باب العلم کے مرہونِ منت ہیں جو اسلام کے مثالی معاشرے کا آخری علمبردار تھا۔ انہی دریچوں سے پاکیزہ افکار و نظریات کی نسیم سحری گزری ہے اور انھیں راہوں پر اسلامی معاشرہ قطرۂ شبنم کی طرح چمکا، مہرِ جہانتاب کی طرح پھیلا اور سیلِ رواں بن کر چلا ہے۔

سن ہجری کا کارواں صدیوں تاریخ کی شاہراہ پر بڑے طمطراق سے گامزن رہا ہے اس کارواں نے ماہ و سال اور روز و شب کے اس مسلسل سفر کا آغاز جس عنوان کے تحت کیا تھا وہ تاریخ کا ایک سنگِ میل بن گیا۔ آغازِ سفر میں اس کے نقشِ قدم کو تاریخ نے بوسے دیئے ہیں، اثنارِ راہ میں قافلوں نے اس کو میرِ کارواں سمجھا ہے۔ اور اب یہ خود گردِ کارواں ہے۔ آج اُن دریچوں سے نسیم سحر نہیں گزرتی، وہ راہیں سنسان پڑی ہیں۔ اور وہ معاشرہ غبارِ راہ کی طرح منتشر ہو چکا ہے۔ اگرچہ اس وقت بھی یہ گرد بہت سے قافلوں کی راہ نما، اس قافلے

کے نقوش بہت سی منزلوں کے چراغ، اور اس کی بانگِ جرس بہنوں کے لئے صدائے بازگشت ہے؛

لیکن اب سن ہجری کا چہرہ اُداس ہے، اس کی سرخیاں مٹ چکیں، اس کا غازہ اتر چکا، اس کا حسن لٹ گیا اور اس کی بہار گزر چکی ہے۔ تاہم اس سن ہجری کی سرگزشت "دیدۂ بینا" کے لئے "سامانِ عبرت" بھی ہے۔ چنانچہ آج کی صحبت سے ہم قرطاس وقلم کے سہارے سن ہجری کا سفر ازسرِنو شروع کر رہے ہیں تاکہ تصورات کے قالب میں روح تازہ اور عمل کے بازوؤں میں خونِ گرم جنبش کر سکے۔

سن ہجری کی یہ سرگزشت اس قلمی آئینے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں امت مسلمہ اپنے ماضی کے عروج و زوال کی جھلک دیکھ سکتی ہے۔ شاید اس سے حال کا موازنہ کرنے اور مستقبل کا خاکہ بنانے میں کچھ مدد مل سکے۔ یہ داستان سرائی ان تاریخ نگاریوں سے مختلف ہے جو واقعات کا پشتارہ، وقت گزاری کا ذریعہ، اور یادداشت کا اک بارِ گراں ہوتی ہیں۔

اس میں حکایات و روایات کی لذتیں نہیں، ہاں یہ عہدِ رفتہ کا آئینۂ حقیقت نما ہے، جس میں محراب و ممبر کا جمال و جلال بھی ہے اور ذکر و فکر کا سوز و گداز بھی، علم و فن کے نقش و نگار بھی ہیں اور دین و دانش کے خدوخال بھی، تعمیر و تنظیم کے نقوش و خطوط بھی ہیں اور سیف و سناں کا زیر و بم بھی، تقویٰ و طہارت کا رنگ و آہنگ بھی ہے اور اخلاق و ایثار کی آب و تاب بھی، زندگی کی دلکشی و رعنائی بھی ہے اور موت کی گرمی و خنک آبی بھی۔ گویا یہ باغ و بہارِ ماضی اور اس کی خزاں رسیدگی کی ایک عبرت انگیز و فکر آموز تصویر ہے۔ اس کے اندر چشم حقائق بیں سن ہجری کے وہ عظیم حوادث اور اس سفر کے وہ اہم موڑ دیکھ سکے گی جن کا ماضی کے اتار چڑھاؤ میں کوئی خاص کردار رہا ہے، جن کی بدولت یہ امت اقوامِ عالم کی پیشرو بنی اور جن کے طفیل یہی امت پس رو بن گئی۔

اس قافلے کی روداد لمبی ہی ہونی چاہیئے جس کے سفر پہ تیرہ صدیاں بیت چکی ہوں، ایک مجلس میں اس داستان بلکہ خلاصۂ داستان کو سنا جا سکتا ہے نہ کہا جا سکتا ہے۔ صدیوں کی کہانی سننے کے لئے کچھ برس تو یقیناً درکار ہوں گے۔ اس لئے تیرہ سو برس کی یہ رواں دواں سرگزشت الفاسم کے صفحات پر ماہ بماہ سنائی جاتی رہے گی۔

"مرتب"

انشاءاللہ آئندہ شمارے سے یہ سرگزشت الفاسم کے صفحات پر دیکھی جا سکے گی۔

الطاف القدس

قسط نمبر ۴

ترجمہ از مولانا محمد کاشف الہاشمی

اجزائے روح معلوم ہو جانے کے بعد اب یہ سمجھ لو کہ ان اجزاء میں سے ہر جزو کی الگ خاصیت ہے پھر جب دو یا دو اجزاء مشترک ہوتے ہیں تو ان میں ایک الگ خاصیت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ زندگی آب و گل یا زندگی آخرت کے جو بھی احوال روح پر طاری ہوتے ہیں ان سب کا حقیقی سبب یہی خواص بنتے ہیں، اسی کثرت اجزاء کی ایک صورت وہ بھی ہے جس کو لطائف نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

روح ہوائی کی تین حالتیں } روح ہوائی کی خاصیت یہ ہے کہ عناصر سے پیوستہ ہو کر عالم ناسوت (دنیا) میں قرار پذیر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے روح ہوائی کو تین حالتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

۱۔ انسانی اعضاء (جوارح) کے سامنے سرنگوں ہو کر صرف ان افعال کی تکمیل کرتی رہے جو اعضاء سے صادر ہوا کرتے ہیں یعنی جو باتیں مقتضائے طبیعت بن کر جوارح سے رونما ہوں، روح ہوائی ہمہ تن ان میں غرق ہو جائے اس صورت کا لازمی مآل یہ ہوگا کہ انسان کا نفس بہیمی ہو کر رہ جائے گا۔

۲۔ جوارح کے اثرات سے پاک ہو، ان کے بجائے اس پر ان اخلاق و صفات کا پرتو ہو جن کا تعلق روح قلب و دماغ سے ہے، یہ پرتو پانے کے بعد پھر دو صورتیں سامنے آئیں گی۔ (الف) یہ کہ صفات قلب و دماغ کے لئے جوارح کی قوت کارکردگی ایک پیکر محسوس اور انداز اتمام کی صورت اختیار کر لے گی یعنی وہ صفات جوارح کی حرکت کے بغیر رونما نہ ہو سکیں گی۔ (ب) یہ کہ اخلاق و صفات خود تو مکمل ہیں مگر جوارح کی حرکت ان اخلاق و صفات کا تقاضا اور شرح بن کر رونما ہو۔ ان دونوں صورتوں میں جو بھی صورت ہوگی اس میں نفس انسانی ہی ہوگا،

۳۔ روح ہوائی بیک وقت دو یا دو سے زیادہ اثرات سے متاثر ہو۔ اس صورت میں نفس ملکی ہوگا روح ملکوتی کی پہچان یہ ہے کہ روح القدس کے سامنے حاضر ہو۔ اس سے اتصال پیدا کرے اور ملاء اعلیٰ سے ربط محکم رکھے۔ روح القدس کا مقام حظیرۃ القدس ہے۔ یہ روح ملکوتی ملاء اعلیٰ کے فرشتوں سے بقدر استعداد ہم زبانی رکھتی ہے، ارواح افلاک سے اس کے دل پر اسرار و رموز کھلتے ہیں۔ مجازات کا معاملہ درحقیقت اسی جزو سے وابستہ ہے، کیونکہ یہ خود بخود حظیرۃ القدس کی طرف ایک انجذابی قوت سے متوجہ رہتا

ہے۔ اگر روحِ ہوائی میں اس طرح کی صفات مرکوز ہیں جو حظیرۃ القدس سے مناسبت رکھتی ہیں تو آرام و راحت کا عنوان بن رہ جائے گا۔ اور اگر معاملہ برعکس ہو تو ایک طرح کی دوری اور نفرت کے آثار کھل جائیں گے۔

روحِ ہوائی، روح القدس سے کس طرح اتصال رکھتی ہے؟ اس کو اس طرح سمجھ لو کہ جیسے پارے کے ایک قطرے میں چاندی اور پانی کی رطوبت بیک وقت موجود ہوتی ہے، چاندی اور پانی کا یہ اتصال اس قدر محکم ہوتا ہے کہ اس کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ عملی تجربہ رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ پارے میں بہاؤ تو پانی کا اثر ہے اور ثقل و وزن چاندی کا کرشمہ ہے۔ یہی صورت روحِ ہوائی اور روحِ علوی کے اتصال و اتحاد کی ہے، ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ناممکن ہے۔ ایک کی کشش پر دوسری کی کشش کا مدار ہے۔ ایک کے رنج و راحت سے، دوسری کو رنج و راحت ہے۔

نفسِ ناطقہ روحِ ہوائی میں نفسِ ناطقہ کا کرشمہ یہ ہے کہ روح کے مختلف اجزائے بدن کو یکجا کرتا، اور ان کی سمت و رفتار مقرر کرتا ہے۔ یہی معاملہ بالکل نباتات میں ہوتا ہے کہ نفسِ ناطقہ اجزاء کی ایک متحدہ صورت بنا کر ایک رخ پر لگا دیتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی پودے یا درخت کی جڑ کاٹ دی جائے تو ایک مدت تک اس کے اجزاء نہیں بکھرتے۔ نفسِ ناطقہ بھی روحِ ہوائی کے مختلف اجزاء کو یکجا کئے رہتا ہے ان کو ایک خاص مزاج اور حالت عطا کرتا رہتا ہے۔ اگر اس روحِ ہوائی اور بدنِ آب و گل کے مابین موت کی چادر تن جاتی ہے، غذا اور نشوونما کا بند و بست بکھر جاتا ہے تو یہ روحِ ہوائی ایک دست و پا بریدہ انسان کی طرح ہو کر رہ جاتی ہے۔ نفسِ ناطقہ برابر اس کی نگہداشت کرتا رہتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی اس روحِ ہوائی میں حسِ مشترک، قوتِ متصرفہ، قوتِ واہمہ، قوتِ متخیلہ، قوتِ حافظہ باقی رہتی ہے۔ عمر بھر کے رچے بسے اعمال و اخلاق، اور قوتِ ارادہ اسی طرح پہلو بدل بدل کر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اب مٹی کے بدن میں سننے اور دیکھنے کے آلے بیکار ہو چکے مگر حس مشترک بیکار نہیں ہوئی۔ آخر حس مشترک نے عمر بھر کانوں اور آنکھوں کے واسطہ سے ادراک حاصل کیا ہے، نہ صرف یہ کہ حاصل کرنے کے آداب سے آشنا رہی بلکہ مدتوں اس کی مشق جاری رہ چکی ہے، لہٰذا اب بھی حسِ مشترک سننے اور دیکھنے کا معاملہ کر رہی ہے۔ ایک تو نفس ناطقہ کی قوتِ کارکردگی کا اثر ہے دوسرے مصلحتِ کلیہ، مصلحتِ جزئیہ سے بے خبر نہیں ہے۔ حسِ مشترک کی تھوڑی سی توجہ بھی اس کو مبدا فیاض سے ہر مسموع آواز اور ہر منظور صورت دلا سکتی ہے۔ جیسا کہ اکثر اس دنیا میں ہوتا ہے۔ اگر ذہن صاف ہو تو کسی چیز کے چند مقدمات سامنے آتے ہی ہم نتیجہ کی صورت پا لیتے ہیں۔

نفسِ ناطقہ اپنی اصلی نسبت کی وجہ سے نفسِ کلیہ کے سامنے مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے، دل کی پوشیدہ رگوں کے ذریعے نایت کبریٰ کا ہر داعیہ قبول کرتا ہے، بواسطہ روحِ ملکوت، فرشتوں کے الہام اور حظیرۃ القدس کے مشاہدات اخذ کرتا ہے، اگر روحِ ہوائی روحِ ملکوت کے تابع ہو جائے تو ایک فرشتے کی طرح ہو جاتی ہے چاہے ملأ اعلیٰ سے تعلق ہو یا ملأ سافل سے۔ ان دونوں کے درمیان ایک جزوِ لطیف ہوتا ہے۔

(از جناب مولانا عبد الغفار حسن صاحب)
(۲)

اختلافِ امّت اور سنّتِ رسولؐ

انکارِ سنت کا نتیجہ اختلاف و انتشار

ہماری تیسری شق یہ تھی کہ منکرین سنت چالیس پچاس سال کے قلیل عرصہ میں باہم جس اختلاف کا شکار ہوئے ہیں وہ سنت کے اختلاف سے کہیں زیادہ ہے، یہاں برسرِ دست دوسرے مسائل سے قطع نظر صرف نماز کے بارے میں منکرین سنت کی آراء کو پیش کیا جاتا ہے۔

برق صاحب اپنی کتاب "ایک اسلام" میں رقمطراز ہیں کہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں عبادت کی کوئی خاص صورت متعین نہیں کی۔ کہیں فرمایا، ہمارا ذکر کرو کہیں صلوٰۃ کی تاکید کی اور کہیں قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم تقدیس کا حکم دیا۔ قرآن کریم نے عبادت کی یہ تمام صورتیں منظور کی ہیں۔ بلکہ ایک مقام پر تو یہود و نصاریٰ کی عبادت کو بھی سرکاری طور پر تسلیم کیا ہے۔ ذکر و عبادت کے یہ مختلف طریقے قابلِ اعتراض نہیں بلکہ مستحق ستائش ہیں۔

ایک اسلام" صفحہ ۴۰، ۳۹ قیاماً و قعوداً کی تشریح بھی انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:۔

مسلمانوں کا کام یذکرون اللہ قیاماً .... الخ

"اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کا پروپیگنڈا کرنا" ("ایک اسلام" صفحہ ۳۱۴)

منکرینِ سنت کا ایک مسلک تو یہ ہوا۔ ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

قرآن کریم میں دو ہی نمازیں مذکور ہیں۔ فجر، عشاء۔ (از خواجہ عباد اللہ اختر "طلوعِ اسلام" اگست سنہ۱۹۵۰ء)

ایک اور صاحب یہ گلفشانی فرما رہے ہیں:۔

"قرآن سے صرف فجر، عصر، اور عشاء کے اوقات واضح ہیں۔ ظہر اور مغرب کا ذکر نہیں"

مطالعہ حدیث صفحہ ۱۴۹، از سید مقبول احمد ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر، ظہر اور مغرب کی زیادتی کیوں ہوئی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"معاشرتی ترقی روکنے کے لیے نماز کے اوقات میں اضافہ ہوا۔ زنادقہ کی طرف سے یہ شرارت ہوئی۔ (مطالعہ حدیث صفحہ ۱۴۹)۔

منکرینِ سنت کے موجودہ گروہ کے سربراہ نماز کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عجم میں مجوسیوں (پارسیوں) کے ہاں پرستش کی رسم کو نماز کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ انہی کے یہاں کا ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کی جگہ نماز نے لی۔ طلوعِ اسلام صفحہ ۵۱۔

یہ حضرات اقیموا الصلوٰۃ سے مراد نظامِ صلوٰۃ لیتے ہیں اور اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے "مذہب میں بھی نظامِ صلوٰۃ نماز کے معنے میں تبدیل ہو گیا جس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا"۔ طلوعِ اسلام صفحہ نظامِ صلوٰۃ کیا ہے؟ لیکن قرآن نے اس تمام تفصیل کو سمیٹ کر ایک فقرہ میں رکھ دیا ہے یعنی ولم نک نطعم المسکین" (سلیم کے نام ص۲۵۲)

غرض یہ نیا گروہ صلوٰۃ سے وہ نظامِ ربوبیت مراد لیتا ہے جو قرآنی اساس پر قائم کیا جائے اور اس میں غرباء و مساکین کو کھانا کھلایا جائے۔ اب بتلایئے کہ ان بھانت بھانت کی بولیوں میں سے کس کو مانا جائے۔ سنت کے شیدائیوں کو اختلاف کا طعنہ دیا جاتا ہے لیکن اگر اس ایک مسئلہ میں حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اختلاف کے شکار منکرین سنت ہیں یا شیدایانِ سنت۔

مسلمانوں کے تمام فرقے نمازوں کے پانچ ہونے میں اختلاف نہیں رکھتے۔ اوقات کے تعین کے لحاظ سے اوقاتِ نماز میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ صرف ایک یا دو مثل اسفار یا غلس کا معمولی اختلاف ہے۔ لیکن کہاں یہ اختلاف کہ سرے سے نماز ہی غائب ہے، یا صرف دو یا تین نمازوں کا منوعی دیا جا رہا ہے۔ نماز کے صریح منکر حضرات بھی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ کا مسلک ہے کہ نماز سے مراد غرباء و مساکین کی شکم پروری ہے، اور دوسرے کا خیال ہے کہ اٹھتے بیٹھتے خدا کا پروپیگنڈا کرو۔

درحقیقت یہ شیرازہ سنت ہی کے طفیل باہم مربوط چلا آ رہا ہے۔ ورنہ انکارِ سنت نے تو اس میں نت نئے اختلافات پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

فقہی اختلافات کی حیثیت:- چوتھی شق یہ تھی کہ فروعی مسائل میں اختلاف کیوں پیدا ہوا۔ اور اس نے شدت کیونکر اختیار کر لی۔

اسلامی تاریخ کے مستند اور قابلِ اعتماد ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہی یا فروعی اختلافات نے صحابہ، تابعین اور امامانِ دین کے زمانے میں وہ شدت اختیار نہیں کی تھی جو بعد میں رونما ہو گئی، دراصل یہ شدت اور فرقہ وارانہ اجنبیت و عصبیت دورِ انحطاط کی پیداوار ہے نہ کہ عہدِ سعادت اور دورِ ترقی کی۔ اسلاف کرام میں فقہی اختلاف کے متعدد اسباب ہیں، جن میں سے ایک سبب کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہاں وضاحت کی جاتی ہے۔

سلف کا اختلاف: حدیث میں ہے آپؐ نے بنی قریظہ (یہودی قبیلے) پر حملے کے موقع پر صحابہؓ کی ایک جماعت کو حکم دیا لا یصلین احد کم صلوٰۃ العصر الا فی بنی قریظہ (صحیح مسلم بحوالہ زاد المعاد ابن قیم) یعنی تم میں سے کوئی نمازِ عصر ادا نہ کرے مگر بنی قریظہ کے علاقہ میں، لیکن اتفاق سے راستہ ہی میں عصر کا وقت آ گیا۔ اس موقع پر فرمانِ نبوی کی تشریح میں ان کے اختلاف کی

کی بنا پر دو رائیں ہو گئیں۔

ایک رائے یہ تھی کہ حدیث کے ظاہری الفاظ کی بنا پر ہمیں بنی قریظہ ہی میں جاکر نماز ادا کرنی چاہیئے۔ دوسری رائے یہ تھی کہ اس ارشاد کا اصل منشاء یہ ہے کہ ہم اتنی جلدی مسافت طے کریں کہ عصر کے وقت بنی قریظہ کے علاقہ میں لازماً پہنچ جائیں۔ اب جب کہ باوجود کوشش کے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے تو ہمیں نماز قضا کرنے کی بجائے راستہ ہی میں ادا کر لینی چاہیئے۔

جب آنحضورؐ کی خدمت میں اس اختلاف کی تفصیل پیش کی گئی تو آپ نے ان دونوں میں سے کسی کو بھی ملامت نہ کی۔ (صحیح بخاری مصری ج ۱ صفحہ ۱۶۸ باب صلوٰۃ الخوف وزاد المعاد ج ۱ صفحہ ۳۲۵)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ سلف صالحین کے درمیان ایک سے زیادہ آراء کا ظہور اس بناء پر ہوا کہ کسی آیت یا حدیث کے مضمون کو متعین کرنے میں اختلاف رونما ہو گیا۔ یہ اختلاف سمجھ بوجھ کا اختلاف تھا نہ کہ کوئی بنیادی اور حقیقی اختلاف۔ اس بناء پر سلف صالحین اس اختلاف رائے کے باوجود باہمی عناد و مخالفت کا شکار نہیں ہوئے۔ اور نہ انہوں نے کبھی یہ گوارا کیا کہ ملت اسلامیہ اس قسم کی صورت حال کی بناء پر مختلف امتوں اور فرقوں میں تقسیم ہو جائے اور نوبت یہاں تک پہنچے کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا بھی گوارا نہ ہو۔

اسلاف کی رواداری فقہی اختلافات کو سلف صالحین کس نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی وسعت ظرف کا کیا حال تھا، اس کی چند درخشاں مثالیں ذیل میں عرض کی جاتی ہیں۔

۱۔ امام احمد کا مسلک تھا کہ فصد کھلوانے اور سینگی لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ ایسے شخص کے اقتداء میں نماز ادا کریں گے جس نے فصد کھلوانے کے بعد وضو نہ کیا ہو۔ امام احمد نے جواب دیا کیا میں سعید بن مسیب اور امام مالک جیسے اہل علم اور اصحاب فتویٰ کی اقتداء میں نماز ادا کرنے سے گریز کر سکتا ہوں؟ مطلب یہ تھا کہ یہ دونوں بزرگ مذکورہ بالا صورت میں وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں ہیں لہٰذا ان کے مسلک کی بناء پر نماز درست ہو گی۔

۲۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بدن سے خون نکلنے پر وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالک کے مسلک اور اجتہاد کی بناء پر سینگی لگوانے کے بعد از سر نو وضو نہ کیا بلکہ سابقہ وضو کی بنیاد پر لوگوں کو نماز پڑھائی۔ قاضی ابو یوسفؒ نے بھی ان کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ بعد میں نماز کو لوٹایا نہیں۔

۳۔ امام شافعیؒ صبح کی نماز میں دعائے قنوت کے قائل تھے اور اس پر پوری پابندی کرتے

تھے۔ ایک مرتبہ بغداد کی کسی مسجد میں ان کو نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا۔ تو انہوں نے دعائے قنوت ترک کردی (مقدمہ للمغنی مرتبہ علامہ رشید رضا)۔

اس قسم کے واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسلاف کے نزدیک فقہی اختلاف کی کیا حیثیت تھی۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ شریعت کے احکام و مسائل دو قسم کے ہیں۔

ا۔ ایسے مسائل جن پر پوری امت کا اتفاق ہے، یا اگر اختلاف ہے بھی تو نہایت ہی ناقابل ذکر۔

ب۔ ایسے مسائل جن کے بارے میں نظر و فکر کا اختلاف ابتداء سے چلا آرہا ہے اور ایک سے زیادہ آراء شروع ہی سے پائی جاتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں شدت اور تعصب برتنا دین میں غلو کے ہم معنیٰ ہے۔ جس کی ممانعت قرآن پاک میں موجود ہے۔ اہل کتاب سے کہا گیا ہے:۔

یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم ولا تقولوا علی اللہ الا الحق (سورہ نساء آیت ۱۷۱)

اے اہل کتاب اپنے دین کے معاملہ میں غلو مت کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف صرف ایسی باتیں منسوب کرو جن کی بنیاد حق پر ہے (اللہ تعالیٰ پر جھوٹے الزامات اور بہتان نہ تراشو)۔

باقی رہے دوسری قسم کے مسائل تو ان کے بارے میں کسی قسم کی مداہنت یا رواداری برتنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم اسلام کے اصل تابناک چہرے کو مسخ ہوتے دیکھنا گوارا کر سکتے ہیں (العیاذ باللہ)

اس تمام تفصیل سے مقصود یہی ہے کہ حامیان سنت گروہی اور فرقہ وارانہ عصبیت اور جمود کو چھوڑ کر باہمی اتحاد کو زندگی کا اولین مقصود قرار دیں۔ اور آپس میں رواداری کی وہ درخشندہ مثالیں از سر نو تازہ کریں جو کہ ہمارے اسلاف کی طرۂ امتیاز تھیں۔

ضرورت ہے کہ ہم ان فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر اصل فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بنیان مرصوص بن جائیں۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ

بقیہ الطاف القدس از قسط (۳)

نفس کلیہ کی قید نے اب اس کو نفس ناطقہ کہلوایا۔ اب یہ نفس ناطقہ اور وہ صورت اجمالی دونوں مل کر اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے ہم لاکھوں تصورات کو نہاں خانۂ دماغ میں لئے لئے پھرتے ہیں۔ پھر بھی مشترکہ قوت انسان کو خطیرۃ القدس تک دوڑاتی ہے۔ یہیں سے اعمال کی تقسیم سجین یا علیین کے اعتبار سے ہو جاتی ہے۔ اگر آدمی نیک عمل کرتا ہے تو اس کی صورت مثالیہ اجمالیہ میں سفید نقطے ظاہر ہوتے ہیں اور اگر بد عمل کرتا ہے تو سیاہ نقطے پھوٹتے ہیں۔ یہی صورت آخرت میں جسم انسانی کے ساتھ ساتھ ہو جائے گی۔ اس طور پر ہاتھ، پاؤں کا بولنا اور اعمال نامے کا سامنے آنا سب کچھ ہو جائیگا۔

انیس احمد صاحب بی، اے

مآثرِ قاسمی

دارالعلوم دیوبند اور مدارس عربیہ کے لئے حضرت نانوتویؒ کے تحریر فرمودہ بنیادی اصول۔

(آخری قسط)

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہی۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ملحوظ رہے۔

(۲) ابقاء طعام طلبہ بلکہ افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳) مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفتِ رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کی پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائیگی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امورِ مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کے مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے۔ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔ اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسی جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ

(باقی صہ۹۱ پر)

حقیقتِ معجزہ

ازحضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ

عادتِ عامہ و خاصہ عادت میں بھی تفصیل ہے، ایک عادتِ عام غیر موقت اور مستمر ہوتی ہے ایسی عادت سے ہر خاص و عام واقف ہوتا جاتا ہے۔ اس کو نقل کیا جاتا ہے مثلاً ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہوا، اور اساتذہ کی عام عادت دیکھی تو وہ یہاں سے اسی عادت کو نقل کرے گا جو مدتِ قیام میں روز مشاہدہ کرتا رہا ہے۔ دوسری عادت موقت یعنی خاص وقت کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اس کو عادتِ خاصہ کہنا چاہیئے۔ مثلاً کوئی ہمیشہ روٹی کھاتا ہے مگر عید کے روز ہمیشہ چاول کھایا کرتا ہے پس جس شخص نے اس کو عید کے روز چاول کھاتے نہ دیکھا ہو وہ کہے گا کہ چاول کھانا اس کی عادت نہیں مگر جس نے دس بیس مرتبہ عید کی عادت بھی دیکھی ہے وہ کہے گا کہ روٹی کی طرح چاول کھانا بھی اس کی عادت میں داخل ہے۔ ایک عام مستمر عادت ہے، دوسری خاص موقت۔ دونوں اپنے اپنے خیال اور تجربہ کے موافق درست کہتے ہیں۔ مگر دوسرے کا کہنا مطابق واقعہ ہے اس لئے کہ اس شخص کی تمام زمانہ پر نظر ہے۔ وہ جیسا عادتِ عامہ سے واقف ہے ویسا ہی عادتِ خاصہ سے بھی آگاہ ہے۔

جس کا نام ہم معجزہ رکھتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کا اک فعل ہے جو اس کی عام عادت کے گو خلاف ہو مگر عادتِ خاصہ کے خلاف نہیں ہوتا، بلکہ اس کے مطابق اور موافق ہوتا ہے۔ کیونکہ خاص خاص اوقات اور خاص خاص مصلحتوں کے وقت عام عادت کے توسط کو چھوڑ کر محض قدرت سے خوارق اور معجزات کا ظاہر کرنا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص عادت ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو ہم نہایت متحمل مزاج اور حلیم الطبع سمجھتے ہیں کہ ہزار گالیاں سننے پر بھی غصہ نہیں آتا، مگر اس کی طبیعت میں یہ بھی ہے کہ مذہب پر اگر کوئی حملہ کرے تو باوجود اس قدر بردباری کے غصہ سے بے تاب ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ کیا یہ اس کی عادت نہیں سمجھی جائے گی؟

اللہ تعالیٰ کی عام عادت ہے کہ اسباب کو مسببات سے پیدا کرتا ہے لیکن یہ بھی اس کی عادت ہے کہ جب اپنے مقربین (انبیاء کرام) کی تصدیق کرانا ہوتی ہے تو ان کے ہاتھوں پر وہ علامات ظاہر کرتا ہے جس سے لوگ یہ سمجھیں کہ بے شک یہ اس کے مقربین اور معتمد خاص ہیں جن کے دعوٰی کی تصدیق کے لئے وہ خلاف معمول چیزیں پیش کر کے ساری مخلوقات کو اس کی مثل لانے سے عاجز

کر دیتا ہے، اور یہی ہونا بھی چاہیئے۔ عقل اور فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خدا اپنے خاص بندوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو دوسروں سے نہ کرے۔ کیا ایک گاؤں کے مکھیا یا نمبردار کے کہنے سے وائسرائے وہ کام کرسکتا ہے جو ایک صوبہ کے گورنر کے کہنے سے کرتا ہے؟ ماں، باپ، بیوی، احباب، اقارب، حکام رعایا غرض ہر ایک کے ساتھ انسان کا معاملہ اور اس کی عادت جداگانہ ہوتی ہے، جو ثابت کرتی ہے کہ یہ حاکم ہے، یہ محکوم ہے۔ اور یہ باپ ہے، یہ لاڈلا بیٹا ہے۔ بسا اوقات جو بے تکلفی یا خلاف طبع امور کا تحمل آدمی اپنے مخلصوں اور دوستوں کی رعایت سے کرلیتا ہے۔ وہ ہرگز ساری دنیا کے دباؤ سے نہیں کرسکتا۔ ایک استاذ کا خاص خاص شاگردوں کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے وہ تمام طلبہ سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں میں عام عادت سے علیحدہ معاملہ کرنا ہی قرین قیاس اور عقل و فطرت کے موافق ہے تاکہ قریب کا قریب اور بعید کا بعید ہونا لوگوں پر واضح ہوجائے۔ اس امر کو ملحوظ رکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ معجزہ فطرت کا مقتضا ہے۔ اس کے مخالف کیونکر ہوسکتا ہے بلکہ اگر معجزات ظاہر نہ ہوں تو یہ حکمت کے خلاف ہوگا، سفاہت ہوگی ع گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی۔ جو لوگ خدا کے یہاں وجیہ ہیں اپنی جان، اپنی آبرو ہتھیلی پر رکھ کر خدا کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور خدا ہی ان سے یہ دعویٰ کراتا ہے کہ آج تمہاری سب کی نجات میرے اتباع میں منحصر ہے۔ ضروری ہے کہ ان کی وجہ سے عام عادت سے بالاتر کارنامے خدا کی قدرت کے ظاہر ہوں جو کہ تمام دنیا کو ایسی نظیر پیش کرنے سے تھکا دیں اور تمام مخلوق کو عاجز کردیں۔ یہی معنی ہیں معجزہ کے۔ یاد رکھئے کہ معجزہ خدا کا فعل ہوتا ہے۔ اس کو نبی کا فعل سمجھنا سخت غلطی ہے۔

معجزہ خدا کا فعل ہے:- معجزہ قانون عادت عامہ کے خلاف اور عادتِ خاصہ کے موافق اللہ کا ایک فعل ہے جو کہ تمام مخلوق کو تھکا دینے اور عاجز کردینے والا ہوتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ سچے مدعی نبوت کا وہ رتبہ تمام جہان پر واضح کردے جو کہ اس کے یہاں اُس کو حاصل ہے اور یہی حکمت کا اقتضاء بھی ہے۔ کیا میں اپنے بیٹے کے ساتھ جو عادت برتوں گا وہی ایک عامی آدمی کے ساتھ بھی کروں گا؟ نہیں بلکہ جیسے تعلقات ہوتے ہیں ویسا ہی معاملہ ہوتا ہے پس ضروری ہے کہ اللہ کے ساتھ بھی جن کا جیسا تعلق ہو، ویسا ہی ادھر سے معاملہ اور برتاؤ بھی ہو۔ یہی معجزہ کی حقیقت ہے جس سے

(بقیہ مآثر قاسمی) تو پھر یوں نظر آیا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہوجائیگی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

(تلخیص و ترجمہ از ادارہ)

عورت اور سیاست

معاشرے میں عورت کا مقام

جسطرح عورت کو شریعت نے جنگی مہمات سے سبکدوش رکھا ہے اسی طرح اسے ایسے معاملات میں بھی شرکت کی تکلیف نہیں دی گئی ہے جو سیاست عامہ کے ذیل میں آتے ہیں۔ قرنِ اول کے مسلمانوں نے اس حقیقت کو بخوبی سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے نہ تو کبھی عورت کو ایسے امور میں شرکت پر مجبور کیا جن سے مرد ہی عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور نہ خود عورتوں ہی نے اپنے مخصوص فرائض کے علاوہ زندگی کے دوسرے گوشوں کی طرف پیش قدمی کی۔ چنانچہ فتح مکہ سے قبل جب ابوسفیان مدینہ آئے تاکہ ان کی جماعت کی طرف سے جو عہد شکنی ہوئی ہے اس سلسلے میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کریں تو اس موقع پر خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے کسی مسلمان کی پناہ میں آنے کی کوشش کی۔ ابوسفیان نے متعدد اشخاص سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور ناکام ہوکر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں آئے، ان سے اپنی خواہش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ آپ اپنے صاحبزادوں کو اس بات کا حکم دیں کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لینے کا اعلان کردیں۔ مگر حضرت فاطمہؓ نے فرمایا انما انا امرأۃ وانما ذلك الی رسول اللہ۔ میں تو ایک عورت ذات ہوں۔ یہ چیز تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے۔ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراءؓ نے یہ فرماکر گویا مسلمان عورت کے لئے ایک ایسی حد مقرر فرمادی جس سے وہ بخوبی سمجھ سکتی ہے کہ اس کے فرائض اور اس کا دائرۂ عمل کیا ہے۔

بعض حضرات اس واقعہ سے جس میں ایک عورت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی تغلیط کی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ عورت کو سیاست میں دخل دینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ حالانکہ واقعہ اتنا ہے کہ ایک مسئلہ میں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی صحابیہ نے غلطی کرتے ہوئے پایا تو آیہ وآتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئا، اتاخذونہ بہتانا واثما مبینا کے ذریعہ اصل مسئلے کی طرف توجہ دلائی اور اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ امرأۃ اصابت ورجل اخطا۔ حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا کہ عورت نے صحیح کہا اور مرد سے غلطی ہوئی صرف اس لئے تھا تاکہ دوسروں پر یہ بات ظاہر فرمادیں کہ وہ اصل مسئلہ کی طرف رجوع فرما رہے ہیں۔ ورنہ یہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں کہ ایک بار جب آپ نے لعبہ

عمال کو زجر و توبیخ فرمائی اور آپ کی اہلیہ محترمہ نے عتاب کی وجہ دریافت کی تو آپ نے نہایت سخت لہجے میں فرمایا کہ تمہیں اس بات سے کیا واسطہ؟ بہرحال حضرت عمرؓ نے گوارا نہ فرمایا کہ ان کی اہلیہ حکومت کی بات میں اونی سا بھی دخل دیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس واقعہ میں عام مسلمان عورتوں کے لئے بھی نصیحت ہے کہ عورتیں انھیں امور کو انجام دیں جن کی ذمہ داری ان کے دوش پر ڈالی گئی ہے۔ کیونکہ اگر عورتیں سیاست اور لڑائیوں میں حصہ لینا شروع کردیں گی تو انہیں مخصوص خانگی زندگی سے اپنا تعلق ختم کرنا ہوگا اور گھریلو معاشرت تباہ ہوکر رہ جائے گی۔ پروردگار عالم فرماتا ہے۔ وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولی۔

نیز یہ امور اسے اس بات پر مجبور کریں گے کہ وہ بے پردہ ہو کر اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط گوارا کرے اور اس صورت حال سے جو نتائج رونما ہوسکتے ہیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انارکی و بے راہ روی اجتماعی سکون وطمانیت کا دامن چاک کردے گی۔ نام نہاد ترقی یافتہ ممالک کا آزادانہ طریق زندگی اور پھر اس کے تلخ ثمرات ہمارے دعوی کے ثبوت کی ناقابل تردید شہادت ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ فطری اعتبار سے مرد اور عورتیں بہت سی باتوں میں مشترک ہیں لیکن اس کے باوجود مرد میں کچھ ایسی صلاحیتیں بھی پائی جاتی ہیں جن سے عورتیں بے بہرہ ہیں اور عورتوں میں بعض ایسی اہلیتیں ہیں جن سے مرد عاری ہیں۔ سماجی اور جماعتی اصلاح کو ملحوظ رکھتے ہوئے قوانین شریعت میں انسان کی ان دونوں صنفوں کے مخصوص حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ جس قوم یا جماعت نے فطری تقاضوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے عورت و مرد کو ایک صنف میں لانے کی کوشش کی ہے اس کے سامنے اس غلط کوشش کے ثمرات بہت جلد آگئے ہیں۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ نہیں کہ اجتماعی تعمیر میں عورت کا کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔ یقیناً شریعت نے اس کو کامل حریت اور مساوات کا درجہ دیا ہے لیکن اس کے باوجود اس پر صرف ایسی ہی اجتماعی ذمہ داریوں کا بار ڈالا گیا ہے جو اس کی نسوانی طبیعت اور فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ تاکہ ایک عورت اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بعض عورتوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ جہاد فی سبیل اللہ کا ثواب تو مردوں نے حاصل کرلیا۔ آخر ہم کونسا عمل کریں جس سے وہی فضیلت اور ثواب ہمیں بھی حاصل ہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ من قعدت منکن فی بیتھا فانھا تدرک عمل المجاھدین فی سبیل اللہ تعالی والجہاد سنام الاسلام وعموده ودعامته لا ینال الیہ فضلاً واجراً۔ تم میں سے جو عورت گھر میں بیٹھی رہی اسے مجاہدین کے عمل کا ثواب حاصل ہوگا۔ حالانکہ جہاد اسلام کا ایسا پرشوکت فریضہ ہے کہ دیگر اعمال اس

کی (مخصوص) فضیلت میں اس کی برابری نہیں کر سکتے"۔ بہرحال ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ وہ عورت جس نے مردوں کی غیر موجودگی میں گھر کے نظام کو سنبھالے رکھا، اگرچہ میدانِ جنگ کے ہنگاموں سے دور رہی ہو، وہ جہاد کے ثواب میں شریک ہے کیونکہ وہ گھر میں رہتے ہوئے بھی مسلمانوں کی اجتماعی قوت اور خانگی سہار ے کا باعث بنی ہوئی ہے اور ایک وہ فریضہ انجام دے رہی ہے جو اس کی فطرت اور خلقی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ الغرض یہ حد بندیاں اور قیود شریعت کی جانب سے اس لئے ہیں تاکہ عورتوں کا عبنی مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو اور اس کے غلط نتائج سے معاشرت محفوظ رہے۔

حدیث صحیح میں آتا ہے لا یخلون احدکم بامرأۃ الامع ذی رحم۔ (تم میں سے کوئی کسی نامحرم عورت کے ساتھ ہرگز تنہائی میں اکٹھا نہ ہو۔) اس حکم کی اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ازواج مطہرات کو پروردگار عالم نے پردے کا حکم دیا۔ حالانکہ انھیں امہات المومنین کا درجہ بخشا گیا ہے۔ اسی طرح رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بیعت کے وقت اپنی معصومیت اور منصب رسالت کے باوجود اپنا دست مبارک عورتوں کے ہاتھ سے مس نہ ہونے دیتے تھے۔ غرضیکہ شریعت کی جانب سے جو قوانین بھی عورتوں کے لئے وضع کئے گئے ہیں اُن سب میں یہ روح کارفرما ہے کہ ایک جانب معاشرے کی اصلاح ہو اور اسی کے ساتھ عورت اپنے مخصوص فرائض کی ادائیگی میں بھی دشواریوں سے دوچار نہ ہونے پائے۔

صحابہؓ کی تبلیغی خدمات

از محمد عبداللہ قاسمی حیدرآبادی فاضل دیوبند

وہ بزرگ، مقدس، بابرکت ہستیاں جنھیں ہم اور آپ صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جن کی شان میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے :-

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم ط

ترجمہ :- میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کی اقتدا کروگے ہدایت پاؤگے۔

اِن برگزیدہ حضرات نے جو تبلیغی خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخِ اسلام کے زریں صفحات پر تابناک نقوش ہیں اور مستقل موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اسلام لانے کے بعد خاموش نہیں بیٹھے بلکہ ایک داعی اور مبلغ بن کر اٹھے، انہوں نے نہ صرف اِردگرد کی فضا کو متاثر کیا بلکہ سرزمینِ عرب سے باہر بھی قدم رکھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کو اسلام سے روشناس اور سینکڑوں کو مائل بہ اسلام کردیا۔

درحقیقت صحابہ کرام اسلام کا نمونہ بن کر نکلے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ تھے، انھیں تبلیغ اسلام کی راہ میں تکلیفوں کی بالکل پرواہ نہ تھی۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ ان کے ذریعہ لوگ دینِ اسلام سے روشناس ہوں اور اس کی تعلیمات کو قبول کریں۔ دین کے مختلف شعبے ہیں اور ان تمام شعبوں پر صحابہ کرام حاوی تھے۔ ان کی تبلیغی خدمت کلمۂ توحید کے پھیلانے تک محدود نہ تھی بلکہ ان کے سامنے درسِ قرآن بھی تھا، تعلیم حدیث بھی ــــ تصوف بھی تھا اور فقہ اور فتاویٰ بھی ــــــــ چنانچہ صحابہ کرام میں ایسی بھی جماعتیں تھیں جو دین کو سیکھنے، سکھانے، سمجھنے سمجھانے کا مستقل کام کرتی تھیں۔

ہمارے سامنے اس وقت تبلیغ اسلام کے ابتدائی تیرہ سال ہیں جسے مکی زندگی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ دکھانا یہ ہے کہ صحابہ کرام کا یہ نمایاں وصف اور عام دستور تھا کہ ہر وہ شخص جو مسلمان ہوتا باوجود مخالف ماحول اور مخالف فضا کے مستقل ایک مبلغ بن جاتا اور جو بات بھی اسلام کی حاصل کرتا بقدر عزم وہمت اس کا پھیلانا، دوسروں تک پہنچانا اس کی زندگی کا ایک مستقل شغلہ بن جاتا۔ اگرچہ ابتدائے اسلام میں صحابہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز نہ تھی۔ اس مختصر جماعت کی یہ حیرت انگیز کامیابی تھی کہ اس کی جدوجہد سے اسلام کی آواز مکہ سے باہر پہنچی۔ اس سلسلہ میں جن حضرات کا نام سرِفہرست آتا ہے ان میں سے حضرت صدیق اکبرؓ

فاروقِ اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ جیسی شخصیات کو تاریخ میں نمایاں ترین اور عالمگیر حیثیت حاصل ہے۔ جنہوں نے اپنی روشن ضمیری، علمی و عملی طاقت سے دنیا کی رہنمائی کی۔ اسی فہرست میں مصعب بن عمیر، جعفر طیار، ابو عبیدہ بن جراح جیسے اولوالعزم اصحاب ہیں جنہوں نے اپنی تبلیغ سے یثرب (مدینہ) حبش، نجران میں اسلام کی اشاعت کی۔ اور اسی فہرست میں لبید، سوید بن صامت (الملقب بہ کامل) اور انیس (برادر ابوذر غفاری) جیسے فصیح و بلیغ خطیب و شاعر ہیں۔ یہ وہ اربابِ علم و فضل ہیں جن کے علمی فیوض سے ہزار ہا بندگانِ خدا نے استفادہ کیا۔ اور جنہوں نے عرب کے مختلف قبائل کو متأثر کیا۔

آیئے اس اجمال کے بعد ہم صحابہ کرام کی تبلیغی خدمات کا قدرے تفصیلی جائزہ لیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ — آپ کا شمار مکہ کے بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ ہر شخص آپ کی شرافت اور عظمت کا خیال کرتا تھا۔

یہ سعادت آپ ہی کو حاصل ہے کہ بڑوں میں سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور اسلام لاتے ہی تن من، دھن سے خدا اور رسول کی اطاعت کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ما نفعنی مال احد قط کمال ابی بکر۔ یعنی کسی کے مال نے مجھ کو وہ نفع نہیں دیا جو ابو بکرؓ کے مال نے دیا۔

دراصل حضرت ابو بکرؓ نے اپنا اثاثہ اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ کا یہ نمایاں کارنامہ ہے کہ کمزور اور مظلوم مسلمانوں کو ان کے ظالم اور سنگدل مالکوں اور آقاؤں کے پنجوں سے خرید کر چھڑایا اور انہیں اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا۔

بہرکیف ابتداء اسلام میں خفیہ طریقہ سے اسلام کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ جب مسلمانوں کی تعداد (۳۹) تک پہنچی تو صدیق اکبر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اسلام کی تبلیغ کھلم کھلا کی جائے۔ حضور پر نور صلے اللہ علیہ وسلم نے اول تو انکار فرمایا۔ مگر صدیق اکبر کے اصرار پر مسجد حرام میں تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت صدیق اکبرؓ نے تبلیغی خطبہ شروع کیا۔ واضح رہے یہ اسلام میں سب سے پہلا خطبہ تھا۔ اس علی الاعلان تبلیغ پر کفار مکہ بھڑک اٹھے۔ انہوں نے صدیق اکبر کے ساتھ انتہائی ظالمانہ برتاؤ اور سنگدلانہ سلوک کیا۔ حضرت صدیق اکبر کو اپنی ذات سے زیادہ حضور پر نور کی فکر تھی۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے عقبہ بن ابی معیط (ایک کافر) حضور پر نور کے ساتھ نہایت بدسلوکی سے پیش آرہا تھا۔ آپ کے گلوئے مبارک میں چادر ڈال کر گلا گھونٹ رہا تھا۔ کسی نے حضرت ابوبکرؓ کو اس واقعہ کی اطلاع کی۔

ادرک صاحبک۔ یعنی اپنے رفیق کی خبر لو۔ یہ سنتے ہی حضرت صدیق اکبر دوڑے ہوئے خانہ کعبہ پہنچے۔ عقبہ کو دھکے دے کر ہٹایا اور کہا ویلکم اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ و قد

جاءکم بالبینات. یعنی تم پر افسوس ہے، کیا تم ایک شخص کو اس کی اس بات پر مارے ڈالتے ہو کہ میرا رب اللہ ہے اور حال یہ ہے کہ وہ خدا کی جانب سے روشن دلیلیں تمہارے پاس لایا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مبلغ اسلام کی حمایت کرنا بھی ایک تبلیغی خدمت ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت صدیق اکبر نے ہمیشہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور دامے درمے، سخنے ہر ممکن طریقہ سے اسلام کا پرچار کیا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں صدیق اکبر کی تبلیغ و ترغیب سے جو لوگ مسلمان ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔

حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبیدہ بن جراحؓ، حضرت عبداللہ بن ہلالؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت عامر بن فہیرہ ازویؓ حضرت ابو حذیفہؓ بن عتبہ، حضرت ام الفضلؓ، حضرت اسماءؓ بن عمیس، حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ حضرت فاطمہ اخت عمرؓ۔

اسلام کے لئے وہ گھڑی بھی کس قدر نازک تھی جب کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور صدمہ سے صحابہ کرام کا برا حال تھا۔ خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ میں تلوار لے کر کھڑے ہو گئے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرتؐ وفات پا گئے تو اس کا سر قلم کر دوں گا۔

دراصل حضرت عمرؓ کو حضورؐ کی وفات کا یقین ہی نہیں آتا تھا، کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ جیسے حضرت موسیٰ طور پر تشریف لے گئے تھے اسی طرح حضورؐ اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے ہیں، بہت جلد واپس تشریف لے آئیں گے۔ غرض یہ کہ صحابہ کرام سخت حیرانی اور پریشانی میں تھے صرف حضرت صدیق اکبرؓ کا دم تھا کہ اس حادثۂ عظیم کو برداشت کرتے ہوئے بلیغ خطبہ پڑھا جس سے ایک طرف حضرت عمرؓ کے خیال کی اصلاح ہو گئی اور دوسری طرف عام صحابہ میں صبر و ضبط کی تلقین کی صورت پیدا ہوئی، وہ خطبہ یہ تھا۔

اما بعد فمن کان منکم یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان منکم یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت قال اللہ وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئاً وسیجزی اللہ الشاکرین۔

ترجمہ:- جو کوئی محمد کی عبادت کرتا تھا وہ سن لے کہ وہ انتقال کر گئے۔ اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا وہ یاد رکھے کہ اللہ دائم اور ہمیشہ زندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بس رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں کہ جن پر موت وغیرہ نہ آسکے)، سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید بھی ہو جائیں تو کیا؟ تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص الٹا پھر جائے گا تو خدا تعالیٰ کا تو کوئی نقصان نہیں کرے گا

(اپنا ہی کچھ کھودے گا) اور خدا تعالیٰ جلد ہی جزا دے گا۔ حق شناس لوگوں کو۔ (بیان القرآن)
جب صحابہ کرامؓ حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے یہ آیت وما محمد الا رسول۔ الخ سنی تو ان کی آنکھوں سے تذبذب اور استعجاب کا پردہ اٹھ گیا۔ گویا اس وقت محسوس ہوا کہ یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ جو صحابہ میں نسبتاً بہت زیادہ مضطرب تھے، وہ چونک پڑے۔ ان کا بیان ہے کہ جب میں نے حضرت ابوبکرؓ سے اس آیت کو سنا تو زمین میرے پاؤں تلے سے نکل گئی اور (فرط غم سے) میں زمین پر گر پڑا (بخاری شریف)۔

وہ وقت بھی کس قدر ہولناک اور نازک تھا جب کہ ایک طرف ارتداد کی آگ مدینہ سے لے کر نواحِ مدینہ تک مشتعل تھی تو دوسری طرف یہود اور نصاریٰ نے (فتنۂ ارتداد کو دیکھ کر) سرکشی شروع کر دی تھی اس حالت کا نقشہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

وارتدت العرب اما عامۃ او خاصۃ من کل قبیلۃ وظہر النفاق واشرأبت الیہودیۃ والنصرانیۃ وبقی المسلمون کالغنم فی اللیلۃ المطیرۃ لفقد نبیہم وقلتہم وکثرۃ عدوہم۔

ترجمہ۔ عرب کے قبائل مرتد ہو گئے یا تو قبیلے کا قبیلہ یا ہر ایک قبیلے میں سے خاص لوگ اور منافق جن کا وجود ابھی باقی تھا ظاہر ہو گئے۔ یہودیت اور نصرانیت نے سر ابھارا، اور مسلمان اپنے نبی کی وفات پانے اور اپنی قلت اور دشمنوں کی کثرت کی وجہ سے بے یار و مددگار رہ گئے جیسے بکریوں کا گلہ بارش کی تاریک رات میں بغیر چرواہے کے رہ جاتا ہے۔

ایسی خطرناک حالت میں اجلّ صحابہ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے متشدد فی امر اللہ کی رائے تھی کہ مرتدین وغیرہ سے لڑائی نہ کی جائے۔ مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے استقلال حسن تدبیر اور تبلیغ سے ایک طرف صحابہ کرام کی ہمتوں کو بلند کیا تو دوسری طرف فتنۂ ارتداد کا قلع قمع کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ کو کہنا پڑا کہ ان اللہ شرح صدر ابی بکر للقتال فعرفت انہ الحق۔

حضرت ابوبکرؓ کی اس عظیم الشان خدمت کی طرف حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول مشیر ہے لقد قمنا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما کدنا نھلک فیہ لولا ان اللہ اعاننا بابی بکر۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم پر ایسا وقت آ گیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ سے ہماری امداد نہ فرماتا تو ہم بالکل غارت ہو جاتے۔

واقعہ بھی یوں ہی ہے کہ بروقت حضرت ابوبکرؓ کی اولوالعزمی اور ثابت قدمی نے اسلام کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا۔ اور ان فتنوں کا سدّباب کر دیا جن سے دینِ متین کی بنیادیں متزلزل نظر آ رہی تھیں۔

(باقی آئندہ)

انسانیت کے چراغ

حجاج بن یوسف سے کون واقف نہیں. یہ وہ ظالم حکراں تھا جس نے طاقت کے نشے میں حق پرستوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے، لوگ اس کے سامنے سچ بات کہتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ کیونکہ حجاج اپنے مخالفوں کو معمولی معمولی بات پر موت کی سزا دیتا تھا۔

لیکن اسی زمانے میں ایسے برگزیدہ انسان بھی موجود تھے جو اس ظالم سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوئے۔ جب کبھی انہیں سچ بات کہنے کا موقع ملا انہوں نے بے خوف ہو کر حق بات کہی اور اپنی جان کی ذرا پروانہ کی۔ ایسے ہی ایک بزرگ تابعی سعید بن جبیر تھے جنہوں نے حجاج کے منہ در منہ اعلان حق کیا۔ سعید نے ظالم حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی بشکست کے بعد یہ مکہ چلے آئے تھے۔ حکومت کی طرف سے مکہ کا نیا حاکم بھیجا گیا۔ اس نئے حاکم نے مکہ جاتے ہی ایک تقریر کی۔ اس نے لوگوں سے کہا جو شخص سعید کو پناہ دے گا اس کی خیر نہیں۔ جس شخص کے گھر سعید ملے گا اس کے پڑوسیوں تک کے مکانات ڈھادوں گا۔ پھر اس نے قسم کھائی کہ جس گھر میں وہ ملے گا اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

سعید بڑی دقت کے بعد گرفتار کر لئے گئے۔ مکہ کے حاکم نے انھیں حجاج کے پاس بھیج دیا۔ ظالم کو انتقام کا موقع مل گیا۔ اس نے سعید کو دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ جب آپ دربار میں لائے گئے تو اس نے بڑے تکبر سے پوچھا۔

حجاج - تیرا کیا نام ہے۔ سعید - میرا نام سعید بن جبیر ہے۔ حجاج۔ (غصے سے) تیرا نام شقی بن کسیر ہونا چاہیئے۔ سعید - میرا نام میری والدہ مجھ سے بہتر جانتی تھیں۔ حجاج۔ (اور زیادہ غصہ سے) تو بھی بدبخت، تیری ماں بھی بدبخت۔ سعید۔ (تحمل سے) غیب کا حال جاننے والا تو نہیں ایک اور ہستی ہے۔ حجاج۔ (تنک کر) دیکھ اب میں تجھے موت کے گھاٹ اتارتا ہوں۔ سعید (بے پروائی سے) تب تو واقعی سعادت میرے حصہ میں آئی ہے۔ میری ماں نے میرا نام ٹھیک ہی رکھا تھا۔ حجاج۔ اب میں تجھے زندگی کے بدلے جہنم رسید کروں گا۔ سعید۔ مگر جنت اور جہنم تیرے اختیار میں ہوتا تو میں تجھے معبود بنالیتا۔ حجاج (بھڑک کر) اب تیرے لئے ہلاکت ہے۔ سعید۔ ہلاکت اس شخص کے لئے جو جنت سے ہٹا کر جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ حجاج۔ (نرم لہجے میں) تجھے کس طرح سے قتل کروں؟ سعید۔ جس طرح تجھے اپنا قتل ہونا پسند ہو۔ حجاج۔ (نرم لہجے میں) کیا تجھے معاف کردوں؟ سعید۔ اصل معافی خدا کا معاف کرنا ہے۔ تیرے معاف کرنے کی

میری نگاہ میں کوئی حقیقت نہیں۔

اب تو حجاج کے غصے کی انتہا ہو گئی۔ اس نے حضرت سعید کے اس لب و لہجہ سے اپنی توہین محسوس کی۔ فوراً جلاد کو بلا کر حکم دیا کہ انھیں قتل کر دو۔ حضرت سعید قتل کا حکم سن کر ہنس دیئے۔ حجاج نے پوچھا ہنسے کیوں آپ نے کہا اللہ تعالیٰ کا تجھ پر حکم دیکھ کر۔

حجاج نے حکم دیا کہ اس کی گردن میرے سامنے اڑا دو۔ آپ نے قتل سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی اور خدا سے یوں مخاطب ہوئے۔

"میں نے اپنا منہ اس پاک ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے اور میں سب طرف سے ہٹ کر اسی کی طرف متوجہ ہوں۔ اور اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں۔"

حجاج نے حکم دیا کہ سعید کا منہ کعبہ کی طرف سے پھیر کر نصاریٰ کے قبلہ کی طرف کر دو۔ چنانچہ زبردستی ان کا منہ پھیر دیا گیا۔ سعید بولے۔ "تم جس طرف بھی میرا منہ پھیر دو گے ادھر خدا ہے اور وہ دل کے بھیدوں سے خوب واقف ہے۔" حجاج نے جھنجھلا کر کہا "اسے منہ کے بل اوندھا ڈال دو۔" آپ نے زمین پر گرتے ہی قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ "ہم نے زمین ہی سے تم کو پیدا کیا پھر اسی میں تم کو لائیں گے اور پھر اسی سے تم کو دوبارہ اٹھائیں گے۔"

حجاج نے تیسری مرتبہ پھر قتل کا حکم دیا تو حضرت سعید بولے۔ "میں تجھے اپنے ایمان پر گواہ بناتا ہوں۔" پھر کلمہ شہادت پڑھ کر فرمایا۔ "یہ امانت حفاظت سے رکھنا۔ قیامت کے دن جب تجھ سے ملوں گا تو لے لوں گا۔" جب شہید کر دیئے گئے تو ان کے جسم سے خون بہت نکلا جس سے حجاج کو بھی حیرت ہوئی۔ اپنے طبیب سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ ان کا دل نہایت مطمئن تھا اور قتل کا ذرا بھی خوف ان کے دل میں نہیں تھا۔ اس لئے خون اصلی حالت پر قائم رہا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب حجاج بن یوسف سے نبرد آزما ہوئے تو ان کی والدہ حضرت اسماءؓ بیمار تھیں آپ والدہ کے پاس تشریف لے گئے اور مزاج پرسی کے بعد بولے "مرنے کے بعد آرام ہے"

حضرت اسماءؓ نے جواب میں فرمایا۔ "شاید تمہیں میرے مرنے کی آرزو ہے۔ لیکن جب تک دو باتوں میں سے ایک نہ ہو جائے میں مرنا پسند نہ کروں گی۔ ایک تو یہ کہ تم شہید ہو جاؤ اور میں صبر کر لوں یا دوسرے تم فتح و ظفر حاصل کرو کہ میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔"

چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہو گئے تو حجاج نے ان کو سولی پر لٹکا دیا۔ حضرت اسماءؓ پیرانہ سالی کے باوجود اس عبرت گاہ میں آئیں اور بجائے اس کے کہ غم کا اظہار کرتیں، حجاج کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "کیا اس سوار کے لئے ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ اپنے گھوڑے سے نیچے اترے"۔

ابن سعود اور فتح ریاض

(قسط نمبر ۳)

ابن سعود نے شہر تو فتح کر لیا لیکن نہ تو نجد کے قبیلے ابھی اس کے شریک ہوئے تھے اور نہ اس کے پاس ابھی کوئی مدافعت کا انتظام تھا۔ بیس برس سے یہ قبیلے دیکھ رہے تھے کہ سعودی رشید کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے تھے اور جب بھی انہوں نے رشید کے مقابلے میں سعودیوں کی مدد کی تو رشید نے ان کو شکست دینے کے بعد ان پر ظلم و ستم ڈھا دیئے۔ ان حالات میں یہ اب ہرگز ابن سعود کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ کچھ لوگ جو ان میں من چلے تھے وہ آ شریک ہوئے۔ باقی ہر طرف سے مایوسی ہوئی۔

ریاض پر قابض ہوتے ہی ابن سعود نے شہر پناہ کی مرمت کا کام شروع کر دیا۔ شہر کے لوگوں نے بڑے ذوق اور محنت سے یہ کام ہاتھ میں لیا۔ انہوں نے شہر پناہ کی خندقوں کو از سر نو صاف کیا شہر پناہ کے شکستہ حصوں کی مرمت کی اور قلعہ کی دیواریں جہاں جہاں سے گر گئی تھیں ان کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اب اس طرح وہ رشید کے آنے والے حملہ کے لئے تیار ہوئے۔

رشید کو جب یہ خبریں پہنچیں تو اس نے سخت کلمات زبان سے نکالے اور کہا کہ میں عنقریب اس طفلِ مکتب کو اس کی گستاخی کا مزہ چکھا دوں گا اور ریاض کے شہریوں کو بتا دوں گا کہ میرے حاکم اور آدمیوں کو مار ڈالنے کی سزا کیا ہوتی ہے۔ اب کے ان کی پوری پوری مرمت کی جائے گی۔

ابن سعود کی کوئی باقاعدہ فوجی تعلیم و تربیت تو ہوئی نہیں تھی اور نہ وہ نپولین کے مقولے ہی جانتا تھا مگر اس کے جنگی احساس نے اس کو متنبہ کر دیا تھا کہ ایک دیوار بند شہر کے اندر کسی بڑی فوج سے محصور ہو جانا سخت غلطی ہوگی۔ اس لئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی جال میں پھنس جائے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ریاض کو مدافعت کے قابل اور محاصرہ برداشت کرنے کے لئے بنا کر خود شہر کے اندر نہ رہے گا۔ بلکہ اپنے جانبازوں کے ساتھ دشمن سے کھلے میدان میں مقابلہ کرے گا اور اپنی نقل و حرکت کے لئے ہر طرف راستے کھلے رکھے گا۔

اس نے اپنی کامیابی کی خبر باپ کو بھیجی اور یہ درخواست کی کہ وہ سب گھر بار کو لے کر اب اپنے شہر کو واپس ہوں۔ عبدالرحمن نے یہ اطلاع پاتے ہی بلا کسی کو کانوں کان خبر کئے ریاض کی طرف کوچ

گیا اور راستے سے بچتا ہوا چلا۔ تھوڑے سے دنوں میں وہ ریاض میں داخل ہوا اور اپنے شاہی محل میں فروکش ہوا۔ مدتوں کا چھٹا ہوا گھر اب پھر نصیب ہوا۔

اس کے آنے کی خبر جب شہر میں پھیل گئی تو لوگ اس کے سلام کو آئے اور اسے اپنا امیر تسلیم کیا۔ چند روز کے بعد عبدالرحمٰن نے علماء اور اکابر کو جمع کیا اور ان کے سامنے حکومت سے دست برداری دی اور اپنی جگہ ابن سعود کو نامزد کیا۔ جب شہریوں نے ابن سعود کو امیر تسلیم کر لیا تو عبدالرحمٰن نے لائق پوتے کو اس کے دادا سعود اعظم کی تلوار جو ایک سو برس سے امیر در امیر خاندان میں چلی آ رہی تھی پیش کی۔ یہ تلوار نہایت عمدہ ہے اور دمشق کے لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے قبضے پر سونا چڑھا ہے۔

عبدالرحمٰن جو بہادر اور جنگجو تھا اب بوڑھا ہو گیا تھا۔ اور اس میں مذہبی علوم اور علوم دینوی کے مطالعے کا ذوق بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت قرآن کریم کی تلاوت اور حدیث کے پڑھنے میں صرف کرتا تھا۔ وہ بیٹے کو ہر وقت مشورے دینے کے لئے آمادہ تھا۔ مگر میدان جنگ میں ان کی سرداری کرنے سے گریز کرتا تھا۔ اس سرداری کے لئے اس کی نظر میں ایک جوان مرد مطلوب تھا جو قوم اور ملک کو سنبھال سکے اور اب وہ پیدا ہو گیا تھا۔

ابن سعود باپ کی بے حد عزت کرتا تھا۔ نماز میں ہمیشہ اس کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا اور اس کے نصائح اور مشورے توجہ سے سنتا اور مانتا تھا۔ اب وہ ریاض کا حکمران تھا۔ لیکن سارے نجد اور جزیرۃ العرب پر ایک دن بادشاہت قائم کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

شہر کو مدافعت کے لئے مضبوط بنا کر ابن سعود اپنی مختصر فوج کے ساتھ ایک دن باہر نکلا اور الافلاج اور الخرج کے شاداب صوبوں کی طرف گیا۔ یہ صوبے نجد کے جنوب میں واقع ہیں۔ ان ہی صوبوں میں اس کی ننھیال کا قبیلہ دواسر رہتا ہے۔ ابن سعود کے ساتھ سو اونٹنی سوار اور چالیس گھوڑا سوار تھے۔ ان میں اس کا بھائی سعد بھی تھا۔ جو اسی کی طرح کا شیر دل اور بہادر تھا۔ اس سفر میں اس نے بہت سے دیہات کا دورہ کیا۔ اور بہت سے قبائل کو آنے والی لڑائی کے لئے اُبھارا۔ اور اس کے بعد اس نے ہر سمت میں گاؤں گاؤں کا دورہ کیا۔ اور قبائل کو رشید کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی۔

رشید کے سپاہی ان اطراف میں آ گئے۔ اور ابن سعود کا پیچھا کرنے لگے، لیکن یہ ایک جگہ زیادہ نہ ٹھہرتا تھا اور بڑی تیزی سے آگے بڑھ جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رشید کی سپاہ جہاں جاتی، گاؤں کا ہر قبیلہ اس کے خلاف فساد پر آمادہ ہو جاتا۔ اور اگر وہ حملہ کرتی تو گاؤں والے مقابلہ پر کھڑے ہو جاتے اور پھر کہیں سے ابن سعود بھی دشمن کی فوج پر آ ٹوٹتا

اگر دشمن کا کوئی دستہ ذرا سا بھی اِدھر اُدھر ہٹ جاتا تھا تو وہ فوراً ہی آ کر اس کا پورا قلع قمع کر دیتا تھا۔ اگر دشمن کے فوجی دستوں کو کسی گاؤں پر کامیابی ہو بھی جاتی تھی تو ابنِ سعود فوراً ہی کہیں سے آموجود ہوتا تھا اور پھر ان کے دلوں میں نیا جوش بھر دیتا تھا۔

ابن سعود کی دھاک تمام اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ چھ آدمیوں سے ریاض کے شہر پر قابض ہو جانے کا حال گاؤں گاؤں پہنچ گیا۔ اور اس کے کارناموں کے افسانے جگہ جگہ بیان ہونے لگے۔ جب لوگ آگ تاپنے کو مل کر بیٹھ جاتے تھے تو اس کی باتیں کہانیوں کے طور پر کہتے تھے۔ کوئی کہتا کہ ابن سعود تین آدمیوں کے سروں کو ایک تلوار کے ہاتھ سے کھول دیتا ہے۔ اور کوئی یہ قصہ سناتا کہ اس نے ایک شہسوار کو جو تیزی سے گھوڑا دوڑائے جاتا تھا ہاتھ بڑھا کر صاف زین سے اٹھالیا اور سر پر گھما کر اس طرح پھینک دیا جیسے کوئی کسی کھونٹے کو پھینکتا ہے۔ کوئی کہتا کہ وہ بڑے بڑے فاصلے ایسی تیزی سے طے کرتا ہے کہ دو مقامات جو ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہوتے ہیں وہاں ایک ہی وقت میں دیکھا گیا ہے۔ ان افسانوں کا اثر قبائل میں یہ ہوا کہ ہر طرف رشید کے خلاف بغاوت ہوگئی۔

رشید نے جب ہر طرف سے بغاوت کی خبریں سنی تو وہ جھنجھلا اٹھا اور اس نے اب کے تو ابن سعود کا بالکل ہی خاتمہ کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے فی الفور ایک بڑی فوج شمار اور حائل کے قبائل کی جمع کی اور اس کو لے کر خود بڑھا اور جلد ریاض کے قریب آ گیا۔ اس نے یہاں آ کر اپنے سرداروں سے مشورہ کیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ کیا وہ شہر کا محاصرہ کرے یا ابن سعود جو باہر قبائل میں بغاوت پیدا کر رہا ہے اس کو تنبیہ کرے؟ لوگوں نے مشورہ دیا کہ وہ شہر کا محاصرہ کرے۔ اور کنوؤں کو گھیرے میں لے لے لیکن اس نے نہ مانا کیونکہ اسے خوب معلوم تھا کہ جب تک ابن سعود باہر ہے اور اس کی پوری طرح سرکوبی نہیں ہوگی محاصرہ بیکار ہوگا۔ ادھر عبدالرحمٰن نے رشید کی آمد کی خبر پاتے ہی مدافعت کی تیاری کر لی، مگر رشید نے شہر پر چڑھائی نہ کی اور وہ جنوب کی طرف اپنا لشکر لے کر چلا گیا۔

وہ الخرج کے شہر الدلم کی طرف چلا۔ یہ شہر باغی ہو گیا تھا اس لئے اس نے یہ ارادہ کیا کہ پہلے اسی پر دھاوا کرے اور شہریوں کو ان کی بغاوت کی خوب سزا دے۔ یہ شہر ریاض سے کوئی ساٹھ میل جنوب کی طرف واقع ہے۔ رشید ریاض کے راستے سے اس شہر کی طرف کو اس لئے بھی آیا تا کہ اس کے اصلی مقصد کا پتہ کسی کو نہ چل سکے، وہ اپنی اس چال میں کامیاب ہوا۔ اور نعجان گاؤں تک بلا کسی کو اطلاع کئے ہوئے پہنچ گیا۔ اس نے خیال کیا صبح ہی وہ شہر الدلم پر چڑھائی کرے گا اور شہریوں کی سرکوبی کرے گا۔

ابن سعود اس شہر سے دور جنوب میں تھا۔ اس کو رشید کی خبر ایک بڑے لشکر کے ساتھ ادھر کی طرف آنے کی ملی تو اس نے خیال کیا اب وہ اصلی وقت آ گیا جس کیلئے اس نے ساری تیاریاں کی ہیں۔ اس نے ریاض سے اپنے بھاگ نکلنے کی خبریں اسی لئے پھیلائی کہ دشمن ادھر کھنچ آئے، وہ اس میں کامیاب ہوا۔ اور اس نے رشید سے کھلے میدان میں مقابلہ کا فیصلہ کیا۔

مکتوب گرامی

از جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایڈیٹر برہان

عزیز مکرم ۔ السلام علیکم

القاسم برابر پہنچ رہا ہے۔ شکریہ! یہ پرچہ میری ان توقعات کے مطابق ہے جو میں دار العلوم کے فضلا سے رکھتا ہوں۔ آپ کی محنت و کوشش اور سب سے بڑھ کر سنجیدہ علمی ذوق اور ذہن روشن سے امید قوی ہے کہ یہ پرچہ اور ترقی کرے گا۔ اور القاسم (دور اول) کا ثانی ثابت ہوگا! عربی درس کے دو صفحے بجائے خود بڑے قیمتی اور لائق قدر ہیں۔ طلبا، تو طلبا، علمائے فحول بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ فجزاکم اللہ۔

برہان کی اشاعت جنوری میں اور دوسرے جدید رسائل کے ساتھ اس پر بھی تبصرہ ہوگا۔ برہان غالبًا آپ کو تبادلہ میں وصول ہو رہا ہوگا۔

والسلام

اخوکم فی العلم

سعید احمد اکبر آبادی

نقد و نظر

خلاصۂ اشرف السوانح:- تالیف خواجہ عزیز الحسن مجذوب تلخیص مولانا نور احمد فاضل دیوبند۔ ناشر ادارہ اشرف المواعظ۔ دیوبند۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$۔ قیمت دو روپیے۔

اس بگڑی ہوئی فضا اور اس مسخ شدہ ماحول میں وہ چراغ بھی اپنی لو دے کر مدھم پڑ چکے ہیں جن کی روشنی میں اس دور کا مارا ہوا انسان سکون اور اطمینان کے کچھ لمحات بسر کر سکتا تھا۔ اب خانقاہوں کو خود خانقاہوں کی تلاش ہے اور محراب خود امام کو ڈھونڈتی ہے۔ مگر اس بدنصیبی کو کیا کہیے کہ خانقاہوں میں خانقاہی بھی ہیں اور محراب میں امام بھی پر رشد و ہدایت کی تشنگی ہنوز باقی ہے اور معرفت و حقیقت کے چشمے آبحیات کی طرح ناپید ہیں۔

ایسے ناہنجار دور میں ان بزرگوں کی خدمات کو تازہ کرنا، ان کے کارناموں کو زندگی بخشنا اور ان کی سیرت کو عصری تقاضوں کے مطابق سامنے لانا، جنہوں نے امت کی تعلیم و تربیت کے لئے اپنا خونِ جگر دے کر رشد و ہدایت کی شمعیں فروزاں کی ہیں اور اپنی پوری توانائیاں صرف کر کے فکر و عمل کی انجمنیں سجائی ہیں ۔ ایک بہت بڑا کام ہے، اتنا بڑا کہ ۔ اگر نیت صحیح ہو اور دل میں اخلاص ہو ۔ تو اس پر اک بڑے اجر کی توقع کی جا سکتی ہے۔

حضرت تھانوی رح اس صدی کی ایک عظیم دینی شخصیت ہیں ان کا کام اور ان کا مقام اتنا رفیع اور اس قدر بلند ہے کہ انھیں مجدد ملت اور حکیم الامت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، انھوں نے جس نہج سے اصلاحِ افکار و اعمال کی خدمت انجام دی ہے وہ حضرت مجدد الف ثانی کے بعد تاریخ تصوف میں دوسری مثال ہے جس میں تصوف کو احسان ہی کی حیثیت دی گئی ہے۔ حضرت تھانوی رح نے تصحیح اخلاق، تہذیب افکار، تعلیم عقائد اور تربیتِ اعمال کا جو ڈھنگ اختیار فرمایا وہ نہ صرف نفسیاتی لحاظ سے کارگر تھا بلکہ صحیح معنی میں کتاب و سنت کا منشا بھی اس طرز تصوف سے پورا ہوتا تھا۔ حضرت تھانوی کی پوری زندگی اور ان کا ۔ ۔ ۔ پورا کام اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا ہے،

حضرت تھانوی رح کی سیرت اور ان کی خدمات میں آئندہ نسلوں کے لئے راہ نمائی موجود ہے، ضرورت ہے کہ آپ کے مواعظ اور آپ کے ارشادات کو امت کے سامنے حکمت اور سلیقے کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ تصوف کے بگڑے ہوئے اور تجدد کے مارے ہوئے شریعت و طریقت کی حقیقت کو سمجھ سکیں اور اسلام کی صراط مستقیم پر لوٹ آئیں۔ اس سلسلے میں کچھ دردمند لوگوں نے اپنی استطاعت کے مطابق پیش قدمی کی ہے۔ ادارہ اشرف المواعظ بھی اس

راہ کا ایک حوصلہ مند مسافر ہے اس ادارہ نے مختصر سی مدت میں حضرت تھانوی رح کے کئی مواعظ اور کئی د
نایاب تصانیف کو از سر نو چھاپ کر وقت کی اک بڑی ضرورت کی تکمیل کی ہے۔

تازہ خدمت ہمارے سامنے خلاصۂ اشرف السوانح ہے۔ اصل کتاب کئی ضخیم جلدوں میں پور
بسط کے ساتھ مجذوب صاحب نے مرتب کی تھی۔ تاہم اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی
کہ کم فرصت لوگ بھی حکیم الامۃ جیسی عظیم شخصیت سے واقف ہوسکیں چنانچہ اس ضرورت کے پیش نظ
"اشرف السوانح جدید" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں حضرت تھانوی رح کا نسب، بچپن، و
تعلیم، تدریس، سلوک، مشاغل، قیام، خارجی و داخلی زندگی، وفات، اصلاح و تربیت، تصانیف
موضوع اور اسمائے مجازین وغیرہ سب ضروری چیزیں اختصار کے ساتھ آگئی ہیں۔ آخر میں ناشر ادارہ نے ا
اور مفید جدت یہ کی ہے کہ تالیفات اشرفیہ کے نام سے حضرت رح کی تصانیف کا جو ایک انڈکس شائ
اسے بھی ساتھ ہی شامل کر دیا ہے جس سے حضرت تھانوی رح کی تقریباً تمام تصانیف ایک نگاہ میں سا
جاتی ہیں۔

یہ خلاصہ تین حصوں پر منقسم ہے جو کارڈ بورڈ کی خوشنما جلد میں یک جا کر دیئے گئے ہیں، دوسرا ح
ہے جو "سیرت اشرف" مصنفہ منشی عبد الرحمٰن سے لیا گیا ہے، یہ جون ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھی اور یہ خلاصہ
میں شائع ہوا ہے۔ اس حصہ میں موجود مجازین کے جو نام درج ہیں ان میں بہت سے حضرات انتقال فرما
اگر اس کی صراحت کردی جاتی تو کتاب کی تاریخی حیثیت میں اضافہ ہو جاتا مثلاً مفتی محمد حسن صاحب بیلا گنبد لا
مولانا عبد الجبار صاحب بہاولپور، مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب، مولانا مفتی سعید احمد لکھنوی۔ یہ حضرا
انتقال فرما چکے ہیں۔ اسی طرح حضرت تھانوی رح کے ممتاز خلفا میں مولانا وصی اللہ صاحب مدظلہم کا نام رہ جانا با
حیرت ہے۔

کہیں کہیں مؤلف سیرت اشرف نے ان مجازین کے بارے میں جو انتقال کر چکے ہیں یہ لکھا ہے کہ وہ
میں حضرت تھانوی رح کی خدمت میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ اندازِ بیان احتیاط کے خلاف ہے اور خود حضرت ک
کے ذوق اور مزاج کے منافی ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ "اشرف السوانح جدید" ہر اس شخص کے مطالعے کی چیز ہے جو اس بات کا ق
ہو کہ "دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا"۔

فصیح الدین دہلوی

رفتارِ عالم

دنیا میں سب سے پہلا آدمی اٹلی کا ایک سائنس دان گلیلیو گلیلیس تھا جس نے اپنی دوربین کا رخ آسمان کی جانب موڑا۔ اور ستاروں کے بارے میں سائنٹفک اصولوں پر معلومات حاصل کیں۔ دوربین سے ہمیں بہت سے ایسے ستاروں اور سیاروں کا پتہ چلا جو آنکھ سے نظر نہ آتے تھے۔

اس کے بعد دھیرے دھیرے نئے نئے آلات اور مشینیں بنتی گئیں۔ انہی آلات کی مدد سے سوویت سائنس دان "اسروف" نے یہ معلوم کیا کہ کون کون سیارہ ہم سے کتنی دور ہے۔ اس کے گھومنے کی رفتار کیا ہے اور وہ سورج کے چاروں سمت کس طرح گھومتا ہے۔

اور انیسویں صدی کے دوران میں دنیا کے سائنس دانوں کی معلومات اس قدر بڑھ گئیں کہ اب وہ کروڑوں میل دور چاند، زہرہ، مشتری، زحل اور مریخ وغیرہ تمام سیاروں کی فضاؤں میں ملے ہوئے کیمیکل اجزاء اور ان کی گرمی، ان کی سردی، ان کا وزن اور ان کی قوتِ کشش کے بارے میں بھی ہر بات پوری تفصیل کے ساتھ بتا سکتے ہیں۔

دوربین ایجاد ہونے کے بعد ستاروں کے حالات جاننے میں فوٹوگرافی نے مدد دی۔ اور اس کے بعد اب ریڈیائی لہروں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ بات اب یقینی ہے کہ انسان سب سے پہلے چاند کو اپنی منزل بنائے گا۔ کیونکہ چاند ہی ہماری زمین سے سب ستاروں کی بہ نسبت قریب ہے۔

چاند ہماری زمین سے تقریباً دو لاکھ ۳۹ ہزار میل دور ہے۔ زمین کے حلقۂ کشش سے نکلنے کے بعد جہاز چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کیونکہ زمین کی فضا سے نکلنے کے بعد آسمانی خلا میں نہ ہوا ہے نہ کوئی قوتِ کشش۔ نہ کوئی اور چیز۔ اور کسی ایسے خلا میں جہاں کسی قسم کی کوئی طاقت کام نہ کرتی ہو اگر کوئی چیز چھوڑی جائے تو وہ چیز ایک جگہ قائم ہو جائے گی لیکن اگر کسی قوت کی مدد سے اس چیز کو ایک بار دھکیل دیا جائے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہی رفتار سے چلتی رہے گی۔ جب تک کوئی دوسری قوت اسے روک نہ دے۔

چنانچہ جہاز جب چاند کے حلقۂ کشش میں پہنچے گا تو چاند کی قوتِ کشش اسے اپنی طرف کھینچنا شروع کردے گی جیسے کششِ ثقل ہر چیز کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ چاند کے حلقۂ کشش میں پہنچنے کے بعد جہاز کو قابو میں رکھنے کے لئے ہمیں ایک ایسی مشین سے کام لینا پڑے گا جو چاند کی کشش کو کم کردے تاکہ جہاز اچانک

چاند کی سطح سے ٹکرا کر ٹوٹ نہ جائے بلکہ دھیرے سے جاکر وہاں ٹک جائے۔

سفر کا یہی طریقہ ہمیں واپس ہوتے وقت استعمال کرنا پڑے گا۔ خلا میں ستاروں کے چھوٹے چھ
ٹکڑے جنھیں شہاب ثاقب یا سنگِ شہابی کہا جاتا ہے چاروں طرف بکھرے رہتے ہیں اور بڑی قوت سے
گھومتے رہتے ہیں۔ ان سے اگر جہاز ٹکرا گیا تو ساری کوششیں رائیگاں ہوں گی اس لئے ان سے ج
کو بچانے کی بھی کوئی صورت ضروری ہے۔ اتنے لمبے سفر کرنے والے جہاز بن چکے ہیں۔ آج کل ا
تجربات کئے جا رہے ہیں۔ ایسے جہازوں کا نام راکٹ رکھا گیا ہے۔ یہ راکٹ گیسوں کے ذریعہ چلیں
لیکن ان کے بارے میں آج تک جو تجربات ہوئے ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ ایک راکٹ اتنا لمبا سفر
کرسکتا۔ ۱۹۴۹ء میں سائنس دانوں نے دو راکٹ ملا کر اڑانے کا بھی ایک تجربہ کیا تھا۔ وہ بھی تین سو میل
اونچائی تک جاکر رہ گئے۔ چاند کے سفر کے لئے ایک یا دو راکٹ کام نہیں دے سکتے بلکہ کئی راکٹ ملا کر اڑا
پڑیں گے۔ ایک خاص فاصلے تک جاکر راکٹ بیکار ہوگا تو دوسرا راکٹ کام شروع کر دے گا۔ دوسرا راک
ختم ہو جائے گا تو تیسرا راکٹ کام شروع کر دے گا۔ ایک الجھن یہ تھی کہ جس قدر راکٹ زیادہ ہوں گے ا
ان میں وزن زیادہ ہوگا۔ اور جتنا وزن زیادہ ہوگا اتنا ہی آسمانی خلا میں پہنچنے کے بعد ان کی رفتار کم ہو ج
اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ کم سے کم وزن اور زیادہ سے زیادہ قوت اپنے ساتھ لے جائی جائے

آخر سوویت روس کے سائنس دانوں نے ایک نیا طریقہ سوچ نکالا۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ زمین او
چاند کے بیچ میں ایک مصنوعی سیارہ بنا کر ایک پلیٹ فارم بنا لیا جائے۔

یہ پلیٹ فارم زمین کے چاروں طرف گھومتا رہے گا اور زمین سے جو راکٹ چاند کے سفر کے لئے ر
ہوگا۔ وہ پہلے اس پلیٹ فارم پر جاکر رُکے گا۔ پھر وہاں سے چاند کی سمت اڑے گا۔ اس پلیٹ فارم پر
وہ اپنا زائد وزن کم کر دے گا اور نئی طاقت لے کر خلا میں زیادہ سے زیادہ رفتار سے اڑ سکے گا۔

یہ پلیٹ فارم اس حد پر بنایا جائے گا جہاں زمین کی کشش کا میدان ختم ہو جاتا ہے۔

سوویت سائنس دانوں کا خیال ہے کہ پلیٹ فارم بن جانے کے بعد چاند کے سفر میں کوئی مشکل نہ رہ
ایک چار فوتوں کا راکٹ یعنی جس میں چار راکٹ جڑے ہوئے ہوں گے بڑے مزے سے چاند تک پہنچ سکے
تین راکٹ زمین سے پلیٹ فارم تک جا سکیں گے۔ وہاں تینوں راکٹ الگ ہو جائیں گے۔ صرف چوتھا را
اپنی پوری طاقت کے ساتھ چاند کی سمت روانہ ہو جائے گا۔

چاند کی کشش زمین کی کشش سے چونکہ چھ گنا کم ہے۔ اس لئے اکیلے راکٹ کی قوت ہی چاند کی کشش
سے باہر نکلنے کے لئے کافی ہوگی۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر یہ پلیٹ فارم کامیابی کے ساتھ
گیا تو پھر چاند کا سفر اور دوسرے تمام ستاروں کا سفر آسان ہو جائے گا۔ پلیٹ فارم کے لئے ضروری
کہ وہ ہلکا ہو، مضبوط ہو اور زمین پر بیٹھے ہوئے سائنس دانوں کے قابو میں رہ سکے۔ اسے قابو میں

، کے لیے ریڈیو کی لہروں سے کام لیا جا سکے گا۔

آسمان کی لامحدود گہرائیوں میں ہوا یا کوئی قوت کشش نہیں ہوتی۔ اس لیے وہاں کوئی بھی چیز اگر رکی ہو تو ہمیشہ رکی رہے گی اور متحرک ہو تو ہمیشہ متحرک رہے گی۔

پلیٹ فارم بھی خلا کی اسی حد میں چھوڑ جائے گا جو کشش ثقل کی حد سے ملتی ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ راکٹ جو فارم لے کر جائے گا، اسے اس طرح ایک زبردست دھکا دے گا کہ پلیٹ فارم ایک خاص رفتار سے ، کے چاروں طرف گھومنا شروع کر دے گا اور ہمیشہ گھومتا رہے گا۔ جیسے اگر کسی گول چیز کا ایک سرا رے سے بھاری ہو اور اسے ہم پوری قوت سے کسی ہموار سطح پر لڑھکا دیں تو وہ چیز اس طرف کو ے کی شکل میں مڑتی چلی جائے گی جس طرف کا سرا بھاری ہوگا۔ غالباً بالکل اسی اصول پر پلیٹ فارم جائے گا۔ اس کا ایک سرا بھاری ہوگا جو زمین کی سمت ہوگا۔ اس لیے وہ گھومتے ہوئے ہمیشہ ایک ے کی صورت میں زمین کے چاروں طرف گھومتا رہے گا۔

نہیں کہا جا سکتا کہ چاند تک سفر کرنے میں یا چاند میں پہنچنے کے بعد آدمی کو کس کس مشکل کا سامنا کرنا ے گا۔ سوویت سائنس دانوں نے سوچا ہے کہ پہلے کچھ آدمیوں کو بھیجنے کی بجائے ایک خاص قسم کا چاند میں بھیجا جائے۔ یہ آلہ ٹیلی ویژن کیمرے کی طرح کام کرے گا اور راکٹ کی طرح اڑ کر چاند میں بھیجا ے گا۔ اگر یہ آلہ حفاظت کے ساتھ چاند کی سطح تک پہنچ گیا تو وہاں کے ٹھیک ٹھیک حالات معلوم کرنا کچھ ں نہ رہے گا۔ وہ آلہ جو چاند میں بھیجا جائے گا اس میں بھی ٹیلی ویژن کی مشین اور کیمرہ لگا ہوا ہوگا۔ ، کے ذریعہ زمین کے ٹیلی ویژن سیٹوں پر چاند کی سچی اور صاف تصویریں نظر آنے لگیں گی۔

وہ آلہ چاند میں بھیجنے کے بعد کسی ایک جگہ پر جم کر نہیں رہ جائے گا بلکہ چاند میں چاروں طرف آہستہ ستہ گھومتا رہے گا جس سے چاند کی پوری سطح کے بارے میں ٹھیک ٹھیک حالات معلوم ہو جائیں گے ، سے سفر کی بہت سی مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ اور آدمیوں کے سفر کرنے سے پہلے سائنس داں ان حفاظت کے لیے پوری تیاریاں کر سکیں گے۔

سوویت سائنس دانوں نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ دن قریب ہے جب انسان چاند کے کرہ پر قدم دے گا۔ لیکن یہیں یہ بھی اندیشہ ہے کہ چاند کی سطح پر جو لاکھوں اور کروڑوں سال سے گرد و غبار جمع ہو ہے کہیں پہلا جہاز اس میں دھنس نہ جائے۔ ابھی اس کا تجربہ باقی ہے۔

علم او[ر] [ن]ـروز کتابیں

القاموس الجدید

(جدید اُردو عربی ڈکشنری) تالیف :- وحید الزمان کیرانوی

ضروریاتِ زندگی سے متعلق تمام الفاظ و محاورات، علمی، ادبی، سیاسی، طبی، صنعتی اور بین الا[قوامی] اصطلاحات قابلِ قدر ذخیرہ جو اُردو سے عربی ترجمہ کیلئے بے حد مفید ہے۔ اس قاموس کے بارہ میں مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی ایڈیٹر صدق جدید نے تحریر فرمایا ہے : ابتک اس موضوع پر جو کتابیں [آئی] ہیں ان سب سے بہتر مفصل تر اور جامع۔ سائز خورد صفحات ۶۷۵۔ جلد خوبصورت سنہری ڈائی

خریدارانِ القاسم کے لیے خصوصی رعایت ۲۵ فیصد قیمت: سات روپیے۔

المطالعة المحمودة

تالیف : وحید الزماں کیرانوی

جدید عربی نصاب کی چند مفید کڑیاں جو تعلیمی تجربات کے مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزر چکی ہیں کتابوں کی ترتیب نہایت بامقصد و دل آویز اور مفید و معلومات افزا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ جدید عربی اد[ب] کی ابتدائی راہیں ہموار ہوتی ہیں بلکہ طلبہ کے دل و دماغ کے سادہ اوراق پر دینی معلومات اور اسلا[می] معاشرت کے پاکیزہ نقوش ثبت ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی عام معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یہ ا[یک] خصوصیت ہے جو ــــــ "المطالعة المحمودة" کو ادب کی تمام مروجہ کتب سے ممتاز کرتی ہے۔

مبادی: پچاس نئے پیسے الجزء الاول: پچھتر نئے پیسے الجزء الثانی: پچھتر نئے پیسے

الجزء الثالث والجزء الرابع - زیر طبع

مَعارِفُ المشکوٰة

(از مولانا سید عبد الرؤف صاحب عالی) حدیث کی مقبول عام کتاب "مشکوٰة شریف" کی اُردو شرح مظاہر حق نئے انداز میں ؛ متن مشکوٰة با اعراب ؛ سلیس اردو ترجمہ ؛ سیر حاصل اور عام فہم تش[ریح] ؛ عہد سلف کا مواد ؛ عصر حاضر کی زبان ؛ ایمان پرور اعتقادی مسائل ؛ راویانِ مشکوٰة کے حالات ؛ روایات کی تخریج ؛ اک بسیط و نفیس مقدمۂ حدیث ؛ ایک عظیم القدر شرح صحاح ستہ کا نچوڑ اور دیگر کتب حدیث کا [خلاصہ] ۲۰×۳۰/۸ کے تقریباً سو صفحات پر ہر ماہ ایک ایک جزو کی شکل میں "اشاعت منزل دیوبند" سے شائع ہو رہی ہے قیمت فی جزو دو روپئے علاوہ محصول ڈاک۔ **نوٹ**۔ جو حضرات ایک روپیہ بطور فیس ممبری ارسال فرما کر پورے کے خریدار بن جائیں گے انھیں ہر جز سوا روپے میں علاوہ محصول اور دو روپئے میں مع محصول دیا جائے گا

مکتبہ دار الفکر - دیو بند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

الدرس العربی (۴)

الفعل المضارع

الامثلۃ :-

(۱) يَنْجَحُ الْمُجِدُّ محنتی کامیاب ہوتا ہے یا کامیاب ہوگا
(۲) نَلْعَبُ بِالْكُرَةِ ہم گیند سے کھیلتے ہیں یا کھیلیں گے
(۳) اَلْبَسُ الثِّيَابَ میں کپڑے پہنوں گا یا پہنتا ہوں
(۴) تَقْرَأُ الْمَجَلَّةَ تو رسالہ پڑھتا ہے یا پڑھے گا
(۵) تَأْكُلُ الْبِنْتُ لڑکی کھاتی ہے یا کھائے گی
(۶) اَعُوْذُ بِاللّٰهِ میں خدا کی پناہ میں آتا ہوں
(۷) يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ وہ خدا کے دین میں داخل ہوتے ہیں یا ہونگے
(۸) تُحِبُّوْنَ الْمَالَ تم مال کی محبت کرتے ہو۔
(۹) يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ انسان یاد کرے گا
(۱۰) يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وہ بغیر دیکھے ایمان لاتے ہیں

تشریح :- اوپر کی تمام مثالیں پڑھتے ہی یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ہر مثال کا پہلا لفظ فعل ہے کیونکہ وہ کسی دوسرے لفظ کو ملائے بغیر اپنے معنی بتا رہا ہے اور ساتھ ہی زمانہ بھی سمجھ میں آرہا ہے لیکن سب مثالوں کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر فعل صرف ایک ہی زمانہ کو نہیں بتا رہا ہے بلکہ بیک وقت دو زمانے (حال اور مستقبل) سمجھ میں آرہے ہیں مثلاً پہلی مثال میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ محنت کرنے والے کو کامیابی زمانہ حال میں حاصل ہو رہی ہے یا آئندہ زمانہ میں حاصل ہوگی اسی طرح دوسری مثالوں میں تو ایسے فعل کو جو زمانۂ حال یا زمانہ آئندہ میں کسی کام کے ہونے کو بتائے مُضَارِع کہا جاتا ہے۔

قواعد :- (۱) فعل مضارع وہ فعل ہے جو زمانہ حال یا زمانہ آئندہ میں کسی کام کے ہونے کو بتائے۔
(۲) فعل مضارع کی علامت چار حرف ہیں یعنی ہر فعل مضارع کے شروع میں چار حرفوں میں سے کسی نہ کسی حرف کا ہونا ضروری ہے۔ وہ حرف یہ ہیں :- ہمزہ (أ) نون (نـ) یا (یـ) تا (تـ)
(۳) فعل مضارع کے شروع میں سـ یا سوف ہو تو وہ فعل زمانہ مستقبل کیساتھ خاص ہو جاتا ہے۔
(۴) ماضی کی طرح مضارع کی بھی چودہ شکلیں (صیغے) ہوتے ہیں۔

شکل اول	واحد مذکر غائب	تثنیہ مذکر غائب	جمع مذکر غائب	واحد مؤنث غائب	تثنیہ مؤنث غائب	جمع مؤنث غائب
يَنْجَحُ	يَنْجَحُ	يَنْجَحَانِ	يَنْجَحُوْنَ	تَنْجَحُ	تَنْجَحَانِ	يَنْجَحْنَ
	واحد مذکر حاضر	تثنیہ مذکر حاضر	جمع مذکر حاضر	واحد مؤنث حاضر	تثنیہ مؤنث حاضر	جمع مؤنث حاضر
	تَنْجَحُ	تَنْجَحَانِ	تَنْجَحُوْنَ	تَنْجَحِيْنَ	تَنْجَحَانِ	تَنْجَحْنَ
			واحد متکلم	جمع متکلم		
	.	.	اَنْجَحُ	نَنْجَحُ	.	.

(۱۳) الدرس العربی

(من صحافة الیوم)

خِلَافَاتٌ بَیْنَ الولَایَاتِ المُتَّحِدَة والمَانیا الغَرْبِیة

* تَأَزَّمَتِ المُحَادَثَاتُ الِاقْتِصَادِیَّةُ بَیْنَ الولَایَات المتّحدة وَاَلْمَانیا الغَرْبِیَّة اَمْسِ.

یونائٹڈ اسٹیٹس (امریکا) اورمغربی جرمنی کے باہم اختلا

امریکا اورمغربی جرمنی کے درمیان ہونے والی ا بات چیت میں کرائسس (بحران) پیدا ہوگیا.

سَیَّارَةٌ بِدُوْنِ عَجَلٍ

* اَنْتَجَتِ الیابانُ اَوَّلَ سَیَّارَةٍ مِنْ نَوْعِهَا. وَهِیَ تَسِیْرُ بِدُوْنِ عَجَلٍ فَوْقَ وِسَادَةٍ مِنَ الهَوَاءِ — وقد احتَارَتْ حُکُوْمَةُ الیَابَان فی نَوْعِ الرُّخْصَةِ الَّتِی تُعْطِیْهَا لِهٰذِهِ السَّیَّارَةِ — وَقَدْ اقْتَرَحَ بَعْضُهُمْ بِاِعْتِبَارِهَا طَائِرَةً.

بے پہیوں کی موٹر کار

جاپان نے اپنے طرز کی ایک پہلی کار بنائی ہے. وہ پہیوں کے بغیر ہوا کے گدے پر چلتی ہے — حکومت کو اس بارے میں حیرانی ہے کہ اس کار کے لئے کس قسم کا لائسنس دے — بعض لوگوں نے تجویز پیش کی ہے کہ اُسے ہوائی جہاز مان لیا جائے.

من شجرة واحدة

* اَذَاعَ رَادیو بکین بِاَنَّ شَابًّا عُمْرُه ۱۶ سنةً تَمَکَّنَ من زِرَاعَةِ شَجَرَةٍ تَطْرَحُ طَمَاطِمَ وَبَاذِنْجَانَ فی نَفْسِ الوَقْتِ.

ایک درخت سے

پیکن ریڈیو نے یہ خبر نشر کی ہے کہ ایک نوجوان جس عمر سولہ سال ہے ایک ایسا درخت لگانے میں کامیاب ہوگیا جو ایک ہی وقت میں ٹماٹر بھی دیتا ہے اور بینگن بھی.

عُمْلَة قدیمة

* عَثَرَ رَجُلٌ عَلیٰ عُمْلَة مَلَاباوِیَّة بِالقُرْب من عَرَفات کُتِبَ عَلَیْهَا "بانّه ملایو" وعلیها صورةُ دِیْکٍ.

پرانا سکہ

عرفات کے قریب ایک شخص کو ملایا کا ایک قدیم سکہ اس پر تحریر ہے "بانہ ملایو" اور اس پر مرغ کی تہ بنی ہے.

الفاظ مفردة

تَاَزَّم - بحران پیدا ہوگیا. کرائسس ہوگیا.

اِنْتَاج - بنانا - تیار کرنا.

احتیار - پریشان و حیران ہونا

طَرْحٌ - گرانا - ڈالنا - جھاڑنا

بکین - پیکن - چین کی راجدھانی

تَمَکَّنَ من ... - قابو پالینا. قادر ہوا. سکا. کامیاب ہوا

اِقْتِرَاح - تجویز - تجویز یا رائے پیش کرنا

اِذَاعة - نشر کرنا. براڈکاسٹ یا اناؤنس کرنا

عَثَرَ علی ... یَعْثُرُ عثورا - پانا. معلوم کرنا.

الرُّخْصَةُ - لائسنس

شَابٌّ - نوجوان

عَجَلَة ج عجل - پہیہ ج پہیے.

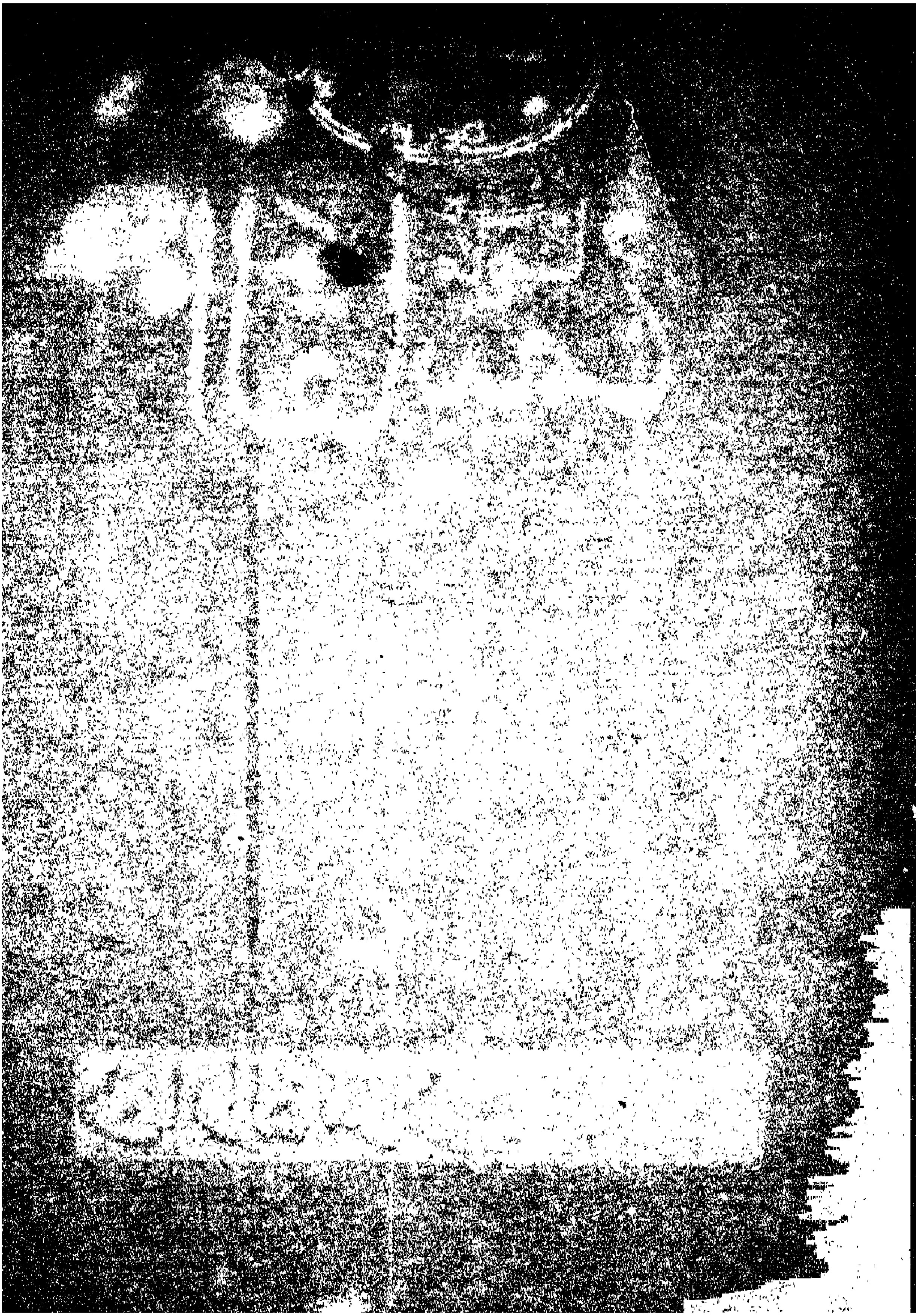
Regd. No. A-1596
Alqasim Monthly Deoband, (U. P.)

ماہنامہ

القاسم

دیوبند

دارالفکر دیوبند



بسم اللہ الرحمن الرحیم

القاسم

ماہنامہ — دیوبند

سرپرست سید عبد الرؤف عالی مظاہری القاسمی

شمارہ ۳ — جلد ۲

سالانہ پانچ روپے — فی پرچہ ۴۰ نئے پیسے

مدیر مسئول: وحید الزمان کیرانوی (فاضل دیوبند)

معاون: ابوالحسن بارہ بنکوی (فاضل دیوبند)

جنوری ۱۹۶۲ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۸۱ھ

ترتیب مضامین

ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر وحید الزماں قاسمی نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند میں چھپوا کر دفتر القاسم دار الفکر دیوبند سے شائع کیا۔

دارالعلوم دیوبند

اور اس کی جائزہ کمیٹی

دارالعلوم دیوبند اپنی عمر کے سو سال پورے کرنے کو ہے۔ اس ایک صدی کے درمیان اس نے آگے بڑھنے کے لیے جتنے قدم اٹھائے اس میں آویزش و اختلاف کے مراحل بھی آئے اور وہ اس نے بخیر و خوبی طے بھی کر لیے۔ ایک اتنا بڑا ادارہ جہاں تعلیم و تدریس کا روز افزوں کاروبار ہوتا ہو وہاں انسانی جذبات و احساسات سے معرّی ہو کر زندگی بسر نہیں کی جا سکتی، تعلیم گاہیں اگرچہ اشیاء کے لین دین کی منڈی نہیں ہوتیں جہاں بسا اوقات کم تولنے اور زیادہ پانے کی خواہش جدال و نزاع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر درس گاہوں میں علم و فضل کی جنس اور فکر و نظر کا سرمایہ لگا ہوتا ہے اور انہی علمی و فکری قدروں کے اسی لین دین کا نام تعلیم و تدریس ہے۔ استاد علم کے پیمانے بھر کر طالب علم کے سامنے رکھتا ہے۔ طالب علم ادب و احترام اور توجہ و انہماک کی سوغات استاد کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ ایک طرف سے شفقت و ہمدردی اور دلسوزی و محبت کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف سے خدمت و اطاعت اور شیفتگی و خود سپردگی کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ ان ہی غیر مادی مگر نشاط انگیز، شخصیت ساز قدروں کے کاروبار سے کوئی درس گاہ ترقی کرتی اور مستحکم ہوتی ہے۔ یہ کاروبار جس قدر معیاری سے معیاری ہوگا اس کے نتائج و ثمرات بھی اتنے ہی کامیاب و اثر انگیز ہوں گے۔ اور جہاں کہیں یہ معیار پست سے پست ہوتا چلا جائے گا، اس کے اثرات بھی اسی درجہ کمزور و مضمحل ہوتے چلے جائیں گے

کوئی تعلیمی ادارہ بہرحال انسانوں ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کو تعلیم و تدریس کے ساتھ ضبط و نظم کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سارے معاملات خود انسانی ہاتھوں ہی سے طے ہوتے ہیں۔ یہاں امیال و عواطف اور جذبات و احساسات سے یکسر فارغ ہو جانا تو یقیناً ناممکن ہے۔ مگر اس میں ذاتی دلچسپیوں اور شخصی رجحانات سے آزاد رہنا بھی بڑے دل گردے کی بات ہے، ایک ایسی بات جس کی صرف انہی لوگوں سے توقع کی جا سکتی ہے جو بے نفسی و جاں سپاری کی احسانی منزلوں سے گزر چکے ہوں اور نفس کو بلک کے ریاض سے جن کی شخصیتیں تعمیر ہوئی ہوں۔

دارالعلوم، آج کا دارالعلوم نہیں ۱۸۶۸ء کا دارالعلوم بلاشبہ انہی میمون و مسعود ہاتھوں سے وجود میں آیا تھا جن میں سے ایک ایک آج کے سینکڑوں اہل علم و فضل پر بھاری تھا۔ جن کے اخلاص و تقویٰ کے تصور

شعور سے دل و دماغ میں تقدس و معصومیت کی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ انہی بے ریا ہاتھوں نے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی
اس برکت و اخلاص کا وہ مسالہ بھر دیا تھا جس کے بل پر دارالعلوم کی رفیع الشان عمارتیں ہی نہیں بنیں، دارالعلوم
کے نظامِ تعلیم کی تکمیل ہوئی اس تاریخ میں آب و تاب دکھائی دی۔ اس کے کارپردازوں میں قوت و صلاحیت
ابھری۔ اس کے افراد میں مرکزیت و مرجعیت آئی۔ اس کے اثرات ہمہ گیر ہوئے، علم و فضل کا مطلع بنا۔ اس سے
اصلاح و ہدایت کے چشمے پھوٹے تبلیغ و تعلیم کا فیض جاری ہوا۔ اس نے سماجی و سیاسی زندگی کو تربیت دی۔
وہ فکر و نظر اور علم و عمل کی سطح پر ملت کے لئے ایک مینارۂ نور بنا اور اس نے استخلاص وطن کی جدوجہد میں رہنمایانہ
فرائض بھی انجام دیئے۔ دارالعلوم کی یہ صدسالہ تاریخ انہی مقدس شخصیتوں کے اخلاص و ایثار سے بنی ہے
ان کے بعد حالات کی تبدیلی، واقعات کی رفتار اور طبائع کے تغیر میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا برکت اخلاص
کا وہ سرمایہ بھی سمٹتا چلا گیا جو بزرگوں نے اسے دیا تھا۔ پہلے اسے ان بزرگوں کا خلوص حاصل تھا جن کے
بارے میں کہا جاتا ہے کہ گناہِ صغیرہ کا خطرہ بھی ان کے دل پر نہیں گزرا۔ ظاہر ہے کہ بعد کے لوگ تقویٰ و
طہارت کی اس ملکوتی عظمت کو چھو بھی نہیں سکتے کتنا ہی عصمت مآب ادارہ کیوں نہ ہو اگر اس میں کچھ
انسانی افراد کسی مقصد کی خاطر جمع ہوں، وہ ضروریات کی تکمیل اور مقاصد کے حصول کے لئے باہمی تعاون
و اشتراک ہی کی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔ طبیعتوں کے اختلاف اور مزاجوں کی صدرنگی سے فطرتاً کبھی کبھی نزاع و
تصادم کی شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں کہیں یہ فکر و نظر کی حدود سے بڑھ کر علم و عمل کی سطح پر نمایاں ہو جاتی ہیں اور کہیں
اس حد تک نہیں پہنچتیں۔

دارالعلوم اپنی اب تک کی تاریخ میں ایسی کتنی ہی الجھنوں سے گزر چکا ہے اور اگر وہ ایک اجتماعی ادارہ
ہے تو اسے آئندہ بھی نہ جانے اسی طرح کی کتنی آویزشوں سے نمٹنا پڑے گا۔ کوتاہیاں اور کمزوریاں
افراد ہی میں ہوتی ہیں اور ان کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دور کرنا بھی افراد ہی کا کام ہے لیکن ہوتا یہ ہے
کہ ایک فرد جو کسی اجتماعی ذمہ داری سے آزاد ہے اپنی خامیوں پر نہ خود گرفت کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے
کو اس بات کا موقع دیتا ہے کہ وہ اس کی خامیاں اس کے سامنے لائے۔ کوئی قومی اور اجتماعی ادارہ جس کا
مقصد وجود ہی کسی اجتماعی خدمت کو انجام دینا ہے وہ ہر ہر قدم پر اس بات کا محتاج ہے کہ اس کی کارکردگی
پر نظر رکھی جائے، اس کے کارپرداز کس طرح اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، اس کا جائزہ لیا جائے
اس کی کارگزاری معیار کے مطابق ہے یا نہیں اس پر زیادہ سے زیادہ نقد و احتساب ہو۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ درحقیقت مسلمانانِ ہند کی ایک نمائندہ جماعت ہے جس کا فرض
دارالعلوم کا نقد و احتساب اور اس کی کارگزاری کا جائزہ لینا ہے۔ جو ایک طرف اس کے ماضی و حال کی
نگراں ہے تو دوسری طرف اس کے مستقبل کی معین و محافظ بھی ہے۔

دارالعلوم اپنے انتظامی اور تعلیمی امور میں اپنے بلند معیار کے پیشِ نظر ہمیشہ ہی سے سخت نقد و احتساب

کایا بند رہا ہے اس کڑے جائزہ کے بغیر دارالعلوم کمزور ترین اخلاقی سطح پر ایک یونیورسٹی تو بن سکتا ہے مگر نہ وہ ماضی کی شب ماہ ہوگی اور نہ مستقبل کی صبح امید۔ وہ صد سالہ دارالعلوم رہ سکتا ہے اور نہ دینی علوم کی آماجگاہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دارالعلوم رفتہ رفتہ ان مقدس، باا ثر اور ہمہ گیر شخصیتوں سے محروم ہوتا جارہا ہے جو دارالعلوم کی چہار دیواری میں علمی و روحانی مجلسوں کی صدر نشین ہوتی تھیں۔ اور اس کا اثر نہ صرف دارالعلوم پر بلکہ مسلمانانِ ہند کی زندگی پر بھی مرتب ہورہا ہے۔ جوں جوں ان چراغوں کی روشنی کم ہورہی ہے تاریکی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسی ہی تاریکیوں میں کمزوریاں اور خامیاں جنم لیتی ہیں۔

ٹھیک یہ ہی موقع ہوتا ہے جب ان کمزوریوں پر گرفت کی جائے۔ اور یہ خامیاں درست کرلی جائیں۔ ورنہ ایک دن یہ ہی خامیاں اور یہ ہی کمزوریاں پوری فضا کو گھیر لیتی ہیں اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ چنانچہ کچھ مدت سے دارالعلوم میں اندرونی طور پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس کے گزشتہ سالوں میں کچھ ناگوار مظاہر سامنے آبھی چکے ہیں۔ مجلس شوریٰ کے ممبران نے اس موقع پر جس نبض شناسی کا ثبوت فراہم کیا ہے اس سے ان کی فہم و دیانت اور اہلیت و صلاحیت پر اعتماد کی راہیں استوار ہوئی ہیں۔ اسی مجلس شوریٰ نے حالات کے تیور دیکھ کر اپنے قابل اعتماد اور لائق ممبران کی ایک سہ نفری کمیٹی مقرر کی۔ جو پوری ذمہ داری اور غیر جانب داری کے ساتھ حالات کا اندازہ کرکے تبدیلی و اصلاح کی مناسب تجویزیں مجلس شوریٰ کے سامنے رکھے۔ اس جائزہ کمیٹی کے تقرر سے فضلائے دارالعلوم اور ہمدردانِ دارالعلوم کے حلقے میں اطمینان و مسرت کا احساس پیدا ہوا۔ جو اندرونی اضطراب کی خبریں سن سن کر پریشان تھا۔

ابھی تک جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سامنے بھی نہیں آئی مگر ان لوگوں نے جنھیں دارالعلوم کے مفاد سے زیادہ اپنے ذاتی مفادات عزیز ہیں اور جو ملت کی ضرورت کے مقابلے میں اپنی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ پیش بندی کے طور پر اس بات کا اظہار کرنا شروع کردیا کہ جائزہ کمیٹی ایک غلط قسم کی کمیٹی ہے۔ اس کی تجویز بالکل بے محل ہے اور اس کے افراد ناقابلِ اعتماد ہیں۔ پھر یہ بات زبانوں سے نکل کر صحافت کے دامن تک جا پہنچی۔ ہفتہ وار معاصر "پیام مشرق" مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۶۲ء میں دل کی یہ پھانس ایک بدنما عنوان بن گئی۔ اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک محترم معاصر کو اتنی زیادہ دلچسپی اور ایسی غیر ذمہ دارانہ سطح پر ہرگز نہیں لینی چاہیئے تھی۔ مسلک کے اعتبار سے بھی دارالعلوم اور اس کے درمیان فرق ہے اور مزاج کے اعتبار سے بھی جس بات کو ابھی تک خود حلقۂ دارالعلوم میں عوامی انداز میں نہیں چھیڑا گیا، اس پر معاصر کو قلم اٹھانا زیب نہیں دیتا۔ حالانکہ اس پر بولنے اور کہنے کا حق فضلائے دارالعلوم کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہے۔ معاصر نے جائزہ کمیٹی کے قیام ہی کو غیر ضروری قرار دیا ہے۔ ہمیں خوب اندازہ ہے کہ معاصر کی یہ معلومات کس بنیاد پر ہیں۔ کچھ مفاد پرست لوگوں نے اپنی اغراض کی خاطر معاصر کو چھیڑ چھاڑ کا یہ شغلہ بہم پہنچایا ہے۔ معاصر سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ بین

سماجی اور سیاسی موضوعات سے دلچسپی رکھتا ہے انھیں میں مشغول رہے۔ اس کی یہ صحافتی خدمات اپنی جگہ ایک بڑی اہم ضرورت کو پورا کر رہی ہیں، وہ دارالعلوم کے اندرونی مسائل کو صحافت میں نہ لائے۔ ورنہ ہمیں اندیشہ ہے کہ آج سیاسی سطح پر اور خارجی حیثیت سے پریس میں جس طرح دارالعلوم کو مطعون وملزم گردانا جارہا ہے وہی حیثیت اس کے داخلی معاملات کی بھی نہ ہو جائے۔ اور پھر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسی دن دارالعلوم کی بساطِ عمر سمٹ جائے گی۔ خدا نہ کرے کبھی وہ وقت آئے۔ مگر ہم بروقت یہ گزارش کیے دیتے ہیں کہ جائزہ کمیٹی میں جو افراد ہیں، خود ان کا جائزہ لیجئے تو اس کمیٹی کے لئے اس سے بہتر افراد مجلسِ شوریٰ منتخب نہیں کرسکتی تھی۔ دیانت دار، مستعد، باخبر اور بے لوث۔ پھر توازن پیدا کرنے کے لئے حضرت مہتمم صاحب بھی شریک کار کی حیثیت سے جائزہ کمیٹی کے ساتھ تعاون فرماتے رہے۔ کمیٹی کے ایک رکن مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند ہیں جن کا تقویٰ وصلاح جمعیۃ علماء کے ہائی کمان میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے رکن مولانا محمد منظور نعمانی ہیں جن کی شخصیت اصلاح وتبلیغ ہی کے لئے وقف ہے اور جن کی بے لوثی اس بات سے ظاہر ہے کہ ان کا تعلق کسی گروہ بندی سے نہیں۔ تیسرے رکن مولانا منت اللہ صاحب ہیں جن کے خلاف غیظ وغضب کی بھٹیاں کچھ افراد کے سینوں میں دہک رہی ہیں اور جن کی شخصیت کو پیام مشرق کے تازہ نوٹ میں تھرڈ کلاس بتایا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں پیامِ مشرق کے کالم نویس نہ محترم مولانا ابوالمحاسن سجاد کی شخصیت سے واقف ہیں نہ مولانا منت اللہ صاحب کی عالی قدر نسبت سے۔ مولانا موصوف ایک ایسے باپ کے بیٹے ہیں جس نے ندوۃ العلماء جیسا ایک ادارہ قائم کر دیا اور جس نے کم از کم چار لاکھ افراد کو رشد وہدایت کے چشمے سے فیض یاب کیا ہے۔ مولانا موصوف ایک بڑے باپ کے بڑے بیٹے ہیں جن میں وہ سب خصوصیات جمع ہیں جو ایسی نسبت رکھنے والوں میں ہونی چاہئیں۔ وہ ایک بہت بڑی درگاہ کے سجادہ نشین ہیں مگر ان کی سجادگی کا تانا بانا چادر چڑھانے اور پھول نذر کرنے سے نہیں بنا۔ وہ ہندوستان کے دو صوبوں کے امیر شریعت ہیں، ایک مرکزی مدرسہ کے سرپرست ہیں۔ انھیں فکر رسا، فکر بلند، نگاہ عمیق، جرأتِ اقدام اور اخلاص وایمان کی وہ دولت ملی ہے جس کا عشر عشیر بھی قلم وقرطاس سے کھیلنے والوں کو میسر نہیں، وہ ہر اعتبار سے اور ہر طرح لائق اعتماد ہیں۔ فضلائے دیوبند کی پوری جماعت انھیں معتمد سمجھتی ہے۔ اُسے ان کی صلاحیت ودیانت پر مکمل بھروسہ ہے۔ جو لوگ چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح صحافت کے ذریعہ مولانا موصوف کو مرعوب یا جائزہ کمیٹی کے کام کو سبوتاژ کیا جاسکے گا وہ سخت مغالطے میں ہیں۔ وہ صحیح معنی میں دارالعلوم ہی کے نہیں، اپنے بھی ہمدرد نہیں۔ ہم بلاکسی رورعایت کے یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر دارالعلوم کے اندرونی مسائل یا اس کی شخصیات پر اس طرح قلم اٹھایا گیا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ القاسم اور دوسرے جریدوں میں جو دارالعلوم کی اندرونی اصلاح وترقی کے متمنی ہیں دلائل وشواہد کے اسلحہ کے ساتھ ان اسباب وعلل کو کھول کر رکھ دیا جائے جن کی بدولت جائزہ کمیٹی کی ضرورت پیش آئی۔ مگر ہم حقیقتاً یہ

چاہتے ہیں کہ چونکہ دارالعلوم کی اندرونی کمزوریوں کی اصلاح اس کا اپنا داخلی معاملہ ہے، وہ جس طرح ان معاملات سے نمٹتا آیا ہے، اب بھی نمٹ لے۔ اس کا ایسے پیچیدہ حالات میں اور نازک موڑ پر اخبارات و رسائل میں آنا ہرگز مناسب نہیں ورنہ اس کی تفصیلات دوسروں ہی کے لئے نہیں ہمارے لئے بھی سخت تکلیف دہ ہوں گی۔ بھلا یہ کس کا جگر ہے کہ وہ اپنے ہی ناخنوں سے اپنے ہی زخم کے بخئے ادھیڑے تاکہ اسے پھر مضبوط رشتہ سے رفو کیا جا سکے۔

ہم جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے منتظر ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ پوری دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ اپنی تجاویز شوریٰ میں پیش کرے۔ اور شوریٰ اس بات سے قطع نظر کہ ان تجاویز سے کسی کے مفاد پر کیا ضرب پڑتی ہے بلا تکلف ان کو عملی جامہ پہنائے۔ اور اگر خدانخواستہ جائزہ کمیٹی کی یہ رپورٹ شوریٰ میں پہنچ کر مصلحتوں کی نذر ہوگئی تو پھر مجلس شوریٰ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گی اور اصلاح کا یہ مطالبہ جو ابھی تک صرف اندرونی معاملہ ہے ایک عوامی معاملہ بن جائے گا۔ جس کے عواقب و نتائج پر ارباب شوریٰ کی نظر رہنی چاہیئے۔ ورنہ کیا کچھ نہ ہو جائے گا کہا نہیں جا سکتا۔ ہمیں افراد سے زیادہ دارالعلوم عزیز ہے۔ افراد پیدا ہو سکتے ہیں۔ دارالعلوم پھر جنم نہیں لے سکتا۔ نہ جانے اس میں کتنے اہل تقویٰ اور اہل صلاح کا خون شامل ہے۔ اور نہ جانے کتنی دینی و ملی تمنائیں اس کے پروان چڑھانے میں صرف ہوئی ہیں۔ کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ اور اب سحر کے بعد شام ہی ہو سکتی ہے، سحر لوٹ کر نہیں آ سکتی۔

ارشاداتِ نبوی

فِقْرِ حق

وَعَنْ مُسْلِمِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سُئِلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ اَلْاٰيَةَ قَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسْئَلُ عَنْهَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَبِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ بِيَدِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَبِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَجُلٌ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اِسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِّنْ اَعْمَالِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلَهٗ بِهِ الْجَنَّةَ وَاِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اِسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِّنْ اَعْمَالِ اَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلَهٗ بِهِ النَّارَ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْ دَاوُدَ۔

ترجمہ: ۔حضرت مسلم بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب سے آیت واذ اخذ ربک الخ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے (جواب میں) فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو میں نے آپ کا یہ ارشاد سنا کہ (پہلے) اللہ نے آدم کو پیدا کیا۔ اس کے بعد اپنا داہنا ہاتھ ان کی پشت پر پھیرا اور اس سے (ان کی) اولاد نکالی۔ پھر فرمایا کہ میں نے ان کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور جنتیوں کے سے عمل کے لئے۔ (لہذا وہ جنت والوں کے سے عمل کرتے ہیں) پھر اللہ نے آدم کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے (ان کی اولاد) باہر نکالی۔ فرمایا کہ انھیں میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور دوزخیوں کے سے عمل کے لئے (لہذا یہ دوزخ والوں کے سے) کام کرتے ہیں، تو (رسول اللہ کا یہ ارشاد سن کر) ایک شخص نے عرض کیا، یارسول اللہ پھر عمل کس لئے ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اللہ جس وقت کسی اپنے بندے کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتی آدمیوں جیسے کام کراتا ہے۔ وہ اپنی موت تک جنتیوں ہی جیسے عمل کرتا رہتا ہے (جن کے باعث) اللہ اپنے اس بندے کو جنت میں داخل کر دیتا ہے اور جب وہ اپنے (کسی) بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے سے عمل کراتا ہے اور مرتے دم تک وہ دوزخیوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے (جس بناء پر) اللہ اسے دوزخ میں ڈال دیتا ہے۔ (مالک، ترمذی، موطا،)

تشریح :- حدیث میں جس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ نویں پارہ کے آخری نصف کے پہلے رکوع میں آئی ہے۔ جس کا سیدھا سا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت و مصلحت سے کام لیا ہے۔ فی الواقع آدمی نہ صرف اللہ کی مخلوق ہے بلکہ اس کا مملوک بھی ہے۔ ہمیں کسی پہلو سے اللہ کے کسی فعل، یا نظامِ کائنات کے کسی گوشے پر اعتراض کا حق نہیں جب کہ ہمارا وجود بھی اپنا نہیں ہمیں نہ اس پر قدرت ہے کہ اپنے آپ کو خود پیدا کر لیں اور نہ یہ قوت حاصل ہے کہ اپنے وجود کو فنا کر لیں، ہماری ذات کا باقی رہنا یا مٹ جانا اسی ہستی کی مرضی پر موقوف ہے جس کے فیضِ کرم سے ہم وجود میں آئے اور جس کی شانِ ربوبیت کے طفیل زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی خاص مصلحت و حکمت کے لحاظ سے ہمیں ان مخصوص اعمال کے کرنے کا حکم دیا ہے جو اللہ کے مقررہ قانون کے مطابق مرنے کے بعد انسان کو آرام و راحت کی ابدی قرار گاہ میں پہنچاتے ہیں۔ اور ان مخصوص اعمال سے باز رہنے کی تلقین کی ہے جو موت کے بعد ہمیشہ کے لئے مصائب و آلام کی وادی میں لے جا ڈالتے ہیں۔ یہ راحتوں کا ٹھکانا جنت کہلاتا ہے اور مصیبتوں کی جگہ جہنم کہلاتی ہے۔

اب یہ اللہ کی صفتِ عدل ہی نہیں بلکہ شانِ رحمت و شفقت ہے کہ اس نے انسان کو نہ صرف زندگی کا ایک ضابطہ و قانون دیا جس کے صدقے میں وہ پریشان و سرگرداں ہونے کی بجائے محفوظ و مامون رہتا ہے بلکہ اسے جنت میں جانے اور دوزخ سے بچنے کی صورتیں بھی بتلائیں۔ تاکہ جس طرح اس کائنات میں خدا کا پیدا کردہ ضبط و نظم کارفرما ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ایک متوازن اور معتدل روش پر کاربند ہو اور جس طرح نظامِ عالم ہر آن اللہ کی اطاعت اور بندگی کا مظاہرہ کر رہا ہے اسی طرح انسان بھی ہر لمحہ عبادتِ الٰہی کا خوگر اور قانونِ خداوندی کا پابند ہو۔ اللہ تعالیٰ انسان کو خواہ مخواہ بغیر کسی ضابطے اور قاعدے کے دوزخ کا ایندھن بنانا نہیں چاہتا۔ اس کی رحمتِ عام کا تقاضا تھا جس نے دوزخیوں کے لئے بھی دوزخ اس وقت تک واجب قرار نہ دی جب تک وہ اپنے اعمالِ بد کی بناء پر اپنے آپ کو دوزخ کا مستحق قرار نہ دے لیں۔

اللہ کے داہنے ہاتھ سے مراد اس کی قدرتِ کاملہ اور قوتِ عاملہ ہے۔ اہلِ عرب اپنے محاورات میں یمین کا لفظ عام طور سے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن یا احادیث میں اس قسم کے جتنے بھی الفاظ ہیں وہ اسی محاورے کے مطابق ہیں جو اہلِ عرب میں رائج تھا اس لئے اس قسم کے جملہ الفاظ اسی محاورے پر محمول ہوں گے
حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کی پشت سے ان کی نسل نکالی گئی اسی طرح ہر نسل کی پشت سے اس کی ذریات کو نکالا گیا۔ اب اس کی مزید تفصیل کیا ہے؟

احادیث اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔ کام کی بات تو صرف اتنی ہے جو قرآن میں بتلائی گئی ہے کہ انسان اپنی فطرت میں معرفتِ حق کا جذبہ لے کر آیا ہے، اس کے وجدان میں حق پسندی شامل

یہ الگ بات ہے کہ ماحول کی آلودگی اور فضا کی گندگی آدمی کے دل ودماغ کو متأثر کردے، ورنہ طبعاً انسان حق کی طرف رغبت اور معرفت حق کا رجحان رکھتا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ابتدائے آفرینش میں نسل انسانی نے عالم غیب میں نہیں بلکہ عالم شہود میں ربوبیت الٰہی کا اقرار کیا، اور اب اس زندگی میں وہ اپنے اس اقرار واعتراف کو بھول جاتا ہے جو اس نے اپنے باپ آدم کے ساتھ اللہ کے حضور کیا تھا۔ اس اقرار کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ قیامت کے دن انسان یہ عذر پیش نہ کرسکے کہ ہم اللہ کی ہستی سے ناواقف اور راہِ ہدایت سے بے خبر تھے اور دوسرا منشا یہ تھا کہ دنیا میں جب اللہ کے رسول اللہ کی ہدایت انسانوں کے سامنے رکھیں تو وہ اس ہدایت کو اجنبی اور نئی چیز سمجھ کر نہ ٹھکرا دیں، بلکہ اپنا بھولا ہوا سبق شوق کے ساتھ قبول کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان نے ابتدائے آفرینش میں معرفت رب کا جو عہد و اقرار کیا تھا اس پر انسان کی پچھلی تاریخ گواہ ہے۔ اللہ کی ہستی کا تصور انسان کا قدیم ترین تصور ہے جو مختلف ملکوں اور قوموں میں مختلف شکلوں میں پایا جاتا ہے۔ اس تصور کی ہمہ گیری اور عمومیت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اللہ کا تصور انسانی ذہن کی بنیادی ساخت میں پیوست ہے اور کسی نہ کسی شکل میں ایک مافوق الفطرت ہستی کا عقیدہ متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوموں میں ہمیشہ سے پایا جاتا ہے۔

پھر جب کبھی اور جہاں کہیں اللہ کے رسول آئے انھوں نے بالعموم اپنے مخاطبین سے اللہ کا وجود نہیں منوایا۔ ان کی دعوت جس بات پر مبنی رہی ہے وہ یہ کہ جس اللہ کو تم اپنا خالق تسلیم کرتے ہو اسی کو اپنا رب اور معبود بھی مانو۔ ان کی دعوت سراسر تذکیر و تنبیہ پر مشتمل رہی۔ گویا انھوں نے آکر لوگوں سے نئی بات نہیں منوائی۔ ہر پیغمبر نے ہمیشہ انسان کے ضمیر کو ہوشیار اور اس کے وجدان کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ خود قرآن کا اندازِ بیان انفس و آفاق کے دلائل پر مشتمل ہے، وہ خود انسان کے وجدان سے ربوبیتِ الٰہی کی شہادت فراہم کرتا ہے۔ پھر یہ واقعہ ہے کہ انسان نے جب کبھی کوئی بات مانی ہے عقل وخرد کی راہ سے کم اور وجدان و ضمیر کی راہ سے زیادہ مانی ہے۔ اس کے علاوہ کسی مسلمہ الہامی مذہب کا آغاز منطقیانہ موشگافیوں اور فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں سے نہیں ہوا۔

یہ ساری چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ ازل میں نسل آدم نے اپنے خدا کے حضور بندگی و عبدیت کا میثاق کیا تھا اور وہ میثاق اگرچہ ایک یادداشت کے طور پر عام انسانوں کے ذہن میں موجود نہیں ہوتا مگر ان کے وجدان اور تحت الشعور میں یہ معاہدہ پوری طرح ثبت ہوتا ہے اور یہی رجحان اس کو فطرتاً حق پسندی اور خدا پرستی کی طرف مائل کرتا ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ کروڑوں آدمیوں کی ذریات بیک وقت آدم علیہ السلام کی پشت سے کس طرح نکل پڑی تو یہ سوال اس ایٹمی دور میں حقیقۃً مضحکہ خیز ہے جب کہ آج سائنس دانوں نے ریت کے ایک حقیر سے ذرے کے اندر لاکھوں منتشر ہونے والے

اجزا دریافت کرلئے۔ اور ہر جزء کے اندر لاتعداد الیکٹرانوں اور پروٹانوں کی حیرت انگیز دنیا میں تحقیق کرڈالیں اگر ریت کے ایک نظر نہ آنے والے ذرّے میں لاکھوں چھوٹے چھوٹے ذرّے سمٹ سکتے ہیں جن کا وجود سراسر مادی ہے تو روح جو عالم وجود کا لطیف ترین جوہر ہے کیوں تھوڑی سی جگہ میں سما نہیں سکتی اور پوری انسانی روحیں کیوں باوا آدم کی پشت چند مربع انچ حصے میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ پھر سائنس کی اس جدید تحقیق کے بعد یہ واقعہ کچھ مستبعد رہنا ہی نہیں چاہیئے کہ ڈاکٹروں نے صرف ایک انسان کے مادۂ منویہ میں بیس لاکھ حیوانی کیڑے دریافت کئے ہیں جن کو اگر مذکورہ تعداد کے مطابق عورتوں میں تقسیم کردیا جائے تو صرف ایک شخص کے نطفے سے ایک وقت میں بیس لاکھ انسان جنم لے سکتے ہیں۔

اس ذیل میں حضرت ابی بن کعب کی روایت جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد واذ اخذ ربك۔الخ کی تشریح کے سلسلہ میں بیان کی گئی ہے، بہت واضح اور صاف ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے پوری نسلِ انسانی کو عقل وشعور کے ساتھ خاص وقت میں اپنے حضور اکٹھا کیا تھا۔ اور اس سے اپنی ربوبیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اپنی بندگی واطاعت کا عہد لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو خدا بتدریج نسلِ انسانی کو عالمِ وجود میں لاسکتا ہے اس کے لئے تمام روحوں کو اجتماعی حیثیت سے زندگی بخشنے اور بندگی کا عہد و پیمان لینے میں کون سا اشکال ہے۔ ذرا اس اہم دور کا تصور کیجئے اور پھر اس آیت اور حدیث کے مضمون کو سامنے رکھئے، کوئی وجہ نہیں کہ شک وشبہ کا ایک کانٹا بھی دل میں ابھرے اور یقین و اذعان کا جذبہ زبان پر فتبارک اللہ احسن الخالقین کے الفاظ نہ لے آئے۔

معارف المشکوٰۃ

(از مولانا سید عبد الرؤف صاحب عالی)

حدیث کی مقبول عام کتاب "مشکوٰۃ شریف" کی قدیم اردو شرح مظاہر حق نئے انداز میں، متن مشکوٰۃ با اعراب سلیس اردو ترجمہ، سیر حاصل اور عام فہم تشریح، عہد سلف کا مواد، عصر حاضر کی زبان، ایمان پرور اعتقادی مسائل راویانِ مشکوٰۃ کے حالات، روایات مشکوٰۃ کی تخریج، اک بسیط و نفیس مقدمہ حدیث، ایک عظیم القدر شرح صحاح ستہ کا نچوڑ اور دیگر کتب حدیث کا حاصل ۲۰×۳۰/۸ کے تقریباً سو صفحات پر ہر ماہ ایک جزو کی شکل میں اشاعت منزل۔ دیوبند سے شائع ہورہی ہے۔ قیمت فی جزو دو روپئے علاوہ محصول ڈاک۔

نوٹ۔ جو حضرات ایک روپیہ بطور فیس ممبری ارسال فرماکر پوری کتاب کے خریدار بن جائیں گے انھیں ہر جزو سوا روپے میں علاوہ محصول اور دو روپئے میں مع محصول دیا جائے گا۔

مکتبہ دار الفکر۔ دیوبند۔ یو۔ پی

انسانیت کے چراغ

ولید کے والد خلیفہ عبدالملک بڑے عقل مند اور دانشور تھے، ان کے اکثر اقوال ضرب المثل بن گئے تھے۔
ایک مرتبہ کسی نے ان سے پوچھا۔
سب سے بہتر کون ہے؟
خلیفہ عبدالملک نے جواب میں فرمایا "جو سر بلندی کی حالت میں تواضع، قدرت کی حالت میں زہد اور قوت کی حالت میں انصاف کرے۔"
روایت ہے جب کہیں سے کوئی شخص خلیفہ عبدالملک کے حضور میں آتا تو وہ کہتے مجھے چار باتوں سے معاف رکھو، ان کے علاوہ جو چاہو کہو۔
"مجھ سے جھوٹی بات نہ کہو۔ کیونکہ جھوٹے کی کوئی رائے نہیں ہوتی۔"
"جو بات تم سے نہ پوچھوں اس کی نسبت مجھ سے کچھ نہ کہو۔"
"میری تعریف نہ کرو۔ میں اپنے آپ کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔"
خلیفہ عبدالملک کے بارے میں تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ "معاویہؓ زیادہ حلیم تھے اور عبدالملک زیادہ محتاط"

⊙

حضرت نعمانؓ سخاوت میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ جب آپ حمص کے والی تھے تو ایک شخص اعشی ہمدانی ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں نے یزید سے مدد کی درخواست کی، لیکن اس نے نہ سنی۔ اب تمہارے پاس آیا ہوں کہ کچھ قرابت کا پاس کرو اور میرا قرض ادا کر دو۔ نعمانؓ کے پاس کچھ نہ تھا۔ قسم کھا کر کہا میرے پاس کچھ نہیں پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ٹھہرو اور منبر پر کھڑے ہو کر بیس ہزار کے مجمع میں ایک خطبہ دیا۔
"اعشی ہمدانی تمہارے ابن عم ہیں، مسلمان ہیں، عالی خاندان ہیں۔ ان کو روپیہ کی ضرورت ہے۔ اور تمہارے پاس اسی غرض سے آئے ہیں۔ اب تمہاری کیا رائے ہے؟"
تمام مجمع ایک زبان ہو کر بولا۔ "جو آپ کا حکم ہو۔"
فرمایا، "تمہیں میں حکم نہیں دیتا مشورہ دیتا ہوں کہ فی کس ایک دینار ــــ نہیں بلکہ دو شخص ایک دینار انہیں دیں۔" سب نے منظور کیا تو کہا کہ سردست میں ان کو بیت المال سے دیئے دیتا ہوں۔ جب تنخواہ کا روپیہ

برآمد ہوگا تو وضع کر لیا جائے گا۔ حضرت نعمانؓ نے دس ہزار دینار اعشی کو دے دیئے۔ چنانچہ اس نے ان کی مدح میں چند اشعار (فی البدیہہ) کہے۔

"حاجتوں کے پیش آنے کے وقت میں نے نعمانؓ بن بشیرؓ کی طرح کا کسی کو نہیں دیکھا۔ جب وہ کچھ کہتے ہیں تو اپنے قول کو پورا کرتے ہیں۔ اس شخص کی طرح نہیں جو لوگوں کی طرف دھوکے کی ڈوری لٹکاتا ہے۔" "اگر یہ انصاری نہ ہوتے تو میں اس شخص کی طرح ہوتا جو کہیں اتر کر ٹھہرے اور کچھ لے کر نہ لوٹے۔" "جب نعمان کا کفران کروں تو مجھ میں احسان مندی کا مادہ نہیں۔ کہ جو شکر گزار نہیں اس میں بھلائی نہیں۔"

⊙

حضرت ابو سعید خدریؓ حق گوئی سے نہ چوکتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے مروان کے دربار میں فضیلت صحابہ کی حدیث بیان کی تو اس نے غصہ میں آ کر انہیں ٹوکا کہ کیا کہتے ہو۔ اس وقت دربار میں مروان کے پاس زید بن ثابت اور رافع بن خدیج بیٹھے تھے۔ حضرت ابو سعید رضؓ نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:

اُن سے پوچھو میں جو کہتا ہوں سچ ہے لیکن یہ کیوں بتائیں گے۔ ایک کو صدقہ کی افسری سے معزول ہونے کا خوف ہے اور دوسرے کو اپنی امیری چھن جانے کا ڈر۔"

اس پر مروان اور زیادہ آگ بگولا ہو گیا۔ اور اس نے مارنے کو دُرّہ اٹھایا ہی تھا کہ ان دونوں بزرگوں نے حدیث کی تصدیق کی۔

⊙

ایک دن مروان حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک جنازہ گزرا جس میں ابو سعید خدری رضؓ بھی شامل تھے۔ مروان اور حضرت ابو ہریرہ رضؓ اپنی جگہ سے اٹھے نہیں۔ تو یہ دیکھ کر حضرت ابو سعید خدری رضؓ نے وہیں سے للکارا:-

"اے امیر جنازہ کے لئے اٹھو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھا کرتے تھے۔"

آپ کے یہ الفاظ سن کر مروان فوراً کھڑا ہو گیا۔

⊙

حضرت معاذ بن جبلؓ انصار میں سے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ طبیعت فطرتاً اثر پذیر واقع ہوئی تھی چنانچہ نبوت کے بارھویں سال جب مدینہ میں اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو حضرت مصعب بن زبیر رضؓ مبلغ اسلام کی وساطت سے اسلام قبول کیا۔ حج کا زمانہ قریب آیا تو حضرت مصعبؓ مکہ روانہ ہوئے۔ معاذ بن جبلؓ بھی ان کے ہمراہ تھے مکہ پہنچ کر عقبہ میں وہ نورانی منظر سامنے آیا جو حضرت معاذ رضؓ کی آنکھوں نے کبھی نہ دیکھا تھا یعنی رسول اللہ صلعم رات کے وقت وہاں تشریف لائے اور مصعبؓ کے ساتھ جو لوگ مدینہ سے آئے تھے اُن سے بیعت لی۔ یہی جماعت مکہ کو مدینہ واپس ہوئی تو گھر گھر نورِ اسلام کو منور کیا

سن ہجری کی سرگزشت
عالی

قبل ہجرۃ کا پس منظر

قبل ہجرۃ ۵۳ھ!

حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت پیر کے دن صبح کے وقت ۹ یا ۱۲ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو ایک بیوہ ماں کے بطن سے ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار نے اپنے اس یتیم فرزند کے لئے دولت کا کوئی آسرا نہیں چھوڑا تھا۔ آپ کی پرورش آپ کے دادا نے کی۔ آپ کا نام محمد رکھا گیا۔ پھر نبوت کے بعد آپ احمد، مصطفیٰ طٰہٰ، یٰسین، کے نام سے اور ابو القاسم کی کنیت سے یاد کئے گئے۔ مکہ میں آپ کی پیدائش اپنے چچا ابو طالب کے مکان میں ہوئی۔ چند روز بعد آپ کو دودھ پلانے کے لئے حلیمہ سعدیہ دائی کے سپرد کیا گیا جہاں آپ نے ابتدائی زندگی کے پانچ سال گزارے۔

تقریباً ۵۷۷ء اور ۴۷ قبل ہجرت میں آپ کی والدہ نے اس بچے کو اس دنیا میں یکہ و تنہا چھوڑ دیا جو ساری دنیا کی رہنمائی کے لئے اٹھنے والا تھا۔ ۵۷۹ء، ۴۵ قبل ہجری میں آپ کے دادا عبد المطلب کا دستِ شفقت آپ پر باقی نہ رہ سکا۔ پھر شفیق چچا ابو طالب نے اپنی تربیت میں لیا۔

بارہ تیرہ برس کی عمر میں تقریباً ۵۸۲ء اور ۴۰ ق ھ کے لگ بھگ چچا کے ساتھ شام کا تجارتی سفر کیا۔ اثنائے سفر میں کچھ عجیب و غریب واقعات پیش آئے۔ جو آپ کی پیغمبرانہ خصوصیات کا اک بے ساختہ اظہار تھا۔ لڑکپن کا زمانہ جس طرح گزرا اس نے مکے کی پوری بستی میں دیانت، امانت اور کیرکٹر و اخلاق کی ایک مثال قائم کر دی، شرک، بت پرستی، کذب، آوارگی اور فسق کے چھینٹوں سے محمد بن عبد اللہ کا دامن بالکل صاف تھا۔ ان کی جوانی، شہوت و شراب کے اس شہر خرابات میں اس طرح بے داغ گزری کہ نگاہیں اس مرد نوخیز کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ دوسروں کے ساتھ تجارت میں شرکت کے علاوہ ان کے بقیہ اوقات بھیڑ بکریاں چرانے میں صرف ہوتے۔ جس فرد کو جہاں بانی کرنا تھی اس نے گلہ بانی کے ذریعہ اس کی تربیت پائی۔

سترہ برس کی عمر میں تقریباً ۳۶ ق ھ میں یمن کا ایک تجارتی سفر کیا۔ جس کے بعد اپنی ذاتی تجارت شروع کر دی۔ اس سن میں قریش کی ایک دولتمند عورت خدیجہ نے آپ کی کاروباری چستی اور دیانت و امانت

کا حال معلوم کر کے اپنا کاروبار آپ کی نگرانی میں دے دیا۔ کئی برس آپ اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے آپ کے حالات و واقعات کی عجیب و غریب روداد جو عرب کے کسی فرد نے کبھی دیکھے نہ تھے، خدیجہؓ کے سامنے آئی تو اس گوہر بے بہا کی پاک جوانی، اُجلے کردار اور کھرے معاملات نے اس کاروباری تعلق کو الفت و محبت اور خدمت و قربت کے اس مقدس رشتے میں سمو دیا جسے نکاح کہتے ہیں۔ ان سے آپ کا نکاح ۲۸ ق ھ میں ہوا۔ جب کہ آپ کی ہونے والی پہلی بیوی خدیجہ جوانی کی آخری سرحد پر کھڑی اپنی عمر کی چالیسویں گرہ باندھ رہی تھیں اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم عمر کے چوبیں سال گزار کر سن شباب کے باغ و بہار میں داخل ہوئے تھے۔

یہ تعلق محمد بن عبداللہ کے لئے فراغت واطمینان کا باعث ہوا۔ جناب خدیجہؓ سے رسول اللہ صلے اللہ کے یہاں تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ تینوں صاحبزادے بچپن ہی میں فوت ہو گئے، چار صاحبزادیوں میں صرف ایک فاطمۃ الزہرا، کے بطن سے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ نسب چلا۔

۱۸ ق ھ میں جب کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۵ سال کی تھی کعبہ کی عمارت کی جدید تعمیر کی ضرورت پیش آئی۔ اس میں حجر اسود کو اپنے مقام پر نصب کرنے کے سلسلہ میں آپ نے عرب کے رؤساء سے اپنی دانشمندی اور معاملہ فہمی کا سکہ منوا لیا۔ اور محمد بن عبداللہ کو "محمد امین" کے تاریخی لقب سے سرفراز کیا گیا پھر وہی محمد امین مسکینوں کا ماوی تھا، محتاج اس کے گھر سے کھانا پاتے، غریب اپنی ضرورتوں میں اس سے مدد لیتے اور مظلوم اپنی پریشانیوں میں اس کی دستگیری سے تسلی پاتے، رفاہِ عام کا اک جذبۂ فراواں تھا جس نے محمد بن عبداللہ کو مظلوموں کی اعانت کے لئے اک انجمن فلاح کا رکن بنایا۔ آپ کی طبیعت میں شروع ہی سے تنہائی پسندی، یکسوئی اور غور و فکر کا مادہ تھا۔ اکثر و بیشتر آپ اپنا وقت بستی سے باہر پہاڑوں کے دامن میں صرف کرنے لگے۔ یہ آخری پانچ سال ۳۵ برس کی عمر سے چالیس برس کی عمر کے درمیان زیادہ تر استغراق والتفات الی اللہ میں گزرنے لگے۔ آپ کی طبیعت یک لخت کاروباری مشاغل سے اور خانگی مصروفیتوں سے اکتا گئی۔ اک نامعلوم شوق، ایک غیر محسوس اضطراب ایک غیر متعین کھٹک، اک نہ بجھنے والی پیاس تھی جس نے آپ کو حیرت و استعجاب کے ساتھ تفکر و تعقل کی محفلوں میں گم کر رکھا تھا۔

گرد و پیش کی دنیا جس میں محمد بن عبداللہ نے عمر کے تیس سے زیادہ سال گزارے تھے وہ بلاشبہ ہمیشہ سے ان کے لئے سینے کی پھانس تھی۔ جس کی کھٹک زندگی کے ہر سانس میں محسوس ہوتی تھی۔ بُرائیوں کے اس سیلاب سے انسانوں کو بچانا چاہتے تھے جس میں وہ گھرے ہوئے تھے۔ عقیدہ و عمل کی گمراہیوں میں بھٹکی ہوئی اور ظلم و جبر کی چکیوں میں پستی ہوئی انسانیت کو وہ برسوں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر امن و سلامتی کی کوئی راہ نظر نہ آتی تھی جس پر انسان کو لے جا کر کھڑا کر دیں۔ اور اطمینان و عافیت کی کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی جس کی بدولت ابن آدم کو فحاشی و آوارگی اور بداخلاقی و بدکرداری کے طوفان سے نجات دلا سکیں۔ اضطراب التہاب جو سینے میں برسوں سے اُبل رہا تھا پھوٹ پڑنے کے لئے تیار تھا۔ اب جوانی کے یہ آخری سال جو تجربہ و عمل کی بھٹی میں پک

چکے تھے، پیغمبرانہ منصب کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو چکے تھے۔ رسالت کا وہ جوہر محمد بن عبداللہ کے خمیر میں یوم پیدائش سے گندھا ہوا تھا اب چمک اٹھنے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔

آپ کی شخصیت اسی خم و پیچ سے گزر رہی تھی۔ گلستان زندگی کا چالیسواں پھول کھل چکا تھا، رمضان کا مہینہ تھا، ۱۷ تاریخ تھی، پیر کا دن تھا۔ ۱۳ ق ھ کا واقعہ ہے۔ آپ حرا پہاڑ کے دامن میں ایک غار کے اندر فروکش تھے کہ بسحردم جب افق پر سپیدۂ سحر پھیل رہا تھا اور افق سے ۱۸ رمضان کا سورج طلوع ہونے کا منتظر تھا ایک نیک خداوند قدوس کا ایک مقدس فرشتہ آیا جس نے محمد بن عبداللہ کو رسالت کی وہ عظیم اور آخری امانت سپرد کی جس نے چند لمحوں میں محمد بن عبداللہ کی شخصیت کو محمد رسول اللہ کی مقدس شخصیت میں تبدیل کر دیا۔ اب وہ نامعلوم اضطراب ایک دعوت حق بن گیا، وہ شوق فراواں اب پیغام رسالت تھا۔ وہ خلش مسلسل اب اسلام کی ایک ندائے عام ہو گئی۔ اب محمد بن عبداللہ جن کے ہاتھوں نے چالیس برس تک کبھی قلم چھوا نہیں تھا۔ جن کی نگاہوں نے کسی کتاب کی سطر نہیں دیکھی تھی، جن کی زبان نے کبھی کوئی صفحہ پڑھا نہیں تھا، وہی اب وادیٔ سینا کے دامن سے دانش و حکمت سے لبریز ایک کتاب ہدایت لے کر مکے کی بستی میں آ گئے۔ اب خود ان کی زندگی کا رخ بدل چکا تھا۔ اب وہ شرک کے مقابلے میں توحید، بداخلاقیوں کے مقابلے میں اخلاق اور باتوں کے مقابلے میں عمل کی دعوت دے رہے تھے۔ توحید، رسالت اور آخرت کی یہ باتیں مکے کی بستی میں بالکل نئی تھیں۔ مگر حق کی یہ دعوت دماغوں کو اپیل کرتی اور دلوں کو اطمینان بخشنے والی تھی۔

پہلی بار وحی کا نزول ہونے کے بعد تین سال تک یہ سلسلہ بند رہا۔ ابتدائی وحی سورہ اقرأ تھی۔ دوسری وحی سورۂ مدثر تھی جس میں آپ کو تسلی دی گئی تھی۔ اس پورے عرصہ میں اسلام کی تبلیغ خاموشی کے ساتھ ہوئی آپ کی جاں نثار بیوی حضرت خدیجہ رض اور آپ کے دمساز ابوبکر صدیق رض اور آپ کے رفیق خانہ حضرت علی رض نے سب سے پہلے آپ کی آواز پر لبیک کہا ۔۔۔ آخر کار خدا کا حکم آیا کہ اسلام کی تبلیغ علی الاعلان کرو۔ یہ چھپنے والی چیز نہ تھی۔ یہ طلوع ہونے والا سورج تھا کہ جسے بادل کے ٹکڑے چھپا نہیں سکتے تھے۔ آخر آپ نے اپنے خاندان کے لوگوں کو اپنے گھر میں جمع کیا، اسلام کی دعوت دی۔ یہ نئی آواز سب نے خاموشی کے ساتھ سنی۔ اسلام تو اس وقت کسی نے قبول نہ کیا۔ مگر خاندان بنی ہاشم نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی امداد و اعانت کی ضرورت یقیناً محسوس کر لی۔

خدا اور سائنس

(از پروفیسر سید عبدالماجد صاحب (مظفر پوری)

قسط (۱)

یوں تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلاق عالم ہے۔ اور جتنی چیزیں آسمان و زمین کے درمیان یا آسمان کے اوپر یا زمین کے نیچے ہیں سب کا خالق وہی ہے۔ لیکن جوں جوں اس کی خلاقیت پر غور کیا جاتا ہے، ایمان میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ فلسفیوں نے یہ بحثیں کی ہیں کہ ایمان بڑھتا گھٹتا نہیں ہے لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ ایک اس شخص کا ایمان جس نے اللہ پاک کو خالق عالم مان لیا ہے، اور ایک اس شخص کا ایمان جو اس کی بنائی ہوئی چیزوں پر غور و خوض کر کے کچھ کیفیات کا علم حاصل کرتا ہے دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جیسے یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان کا خالق خدا ہے، خلاقیت پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن جب یہ غور کرتے ہیں کہ اس نے انسانوں کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ہر شخص کی صورت سیرت، صلاحیت الگ الگ بنائی ہے تو خدا کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں میں یہ کہتا ہوں کہ ایمان بڑھ جاتا ہے۔

ہم لوگ عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس جاننے سے ایمان کمزور ہوتا ہے، اور یہ بے معنی نہیں ہے کیونکہ اکثر سائنس داں غیر مسلم ہوتے ہیں جن کو خدا اور خدا کی خلاقیت کا علم نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ نیچر نے ساری کائنات بنا ڈالی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہم سائنس دانوں کو گمراہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

لیکن میرا اپنا نظریہ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا کوئی راز سمجھ لینا ہی سائنس دانی ہے۔ اگرچہ اس راز کو سمجھنے والا خدا سے ناواقف ہے اور اس کی خلاقیت سے نابلد ہے۔ اگر ایک مومن اس پر غور کرے تو اس کے ایمان میں اضافہ ہوگا۔ ہم کو معلوم ہے کہ اللہ پاک نے ہر بیماری کی دوا پیدا کی ہے کیونکہ ہمارے ہادی برحق نے یہ کلیہ بتا دیا ہے "لکل داءٍ دواءٌ"۔ اب اگر کوئی شخص چین سے ایک جڑی لاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے ملیریا کی بیماری دفع ہوتی ہے، تو لوگ اس کو حکیم یا ڈاکٹر یا سائنس داں کہتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس نے اس راز کو سمجھ لیا ہے کہ اس جڑی میں ملیریا کے جراثیم کو مارنے کا خاصہ ہمارے خالق اکبر نے ودیعت فرمایا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس (سنکونا) کی

افادیت کو جاننے والا خدا کو نہیں جانتا کہ خدا کے رسول نے یہ فرما دیا ہے کہ ہر مرض کے لئے ایک دوا ہے۔ اللہ نے ملیریا کے علاج کی خوبی سنکونا میں پوشیدہ رکھی تھی، جو اس بدنصیب انسان کو معلوم تو ہوا لیکن اس نے اس کے پیدا کرنے والے کو نہ جانا۔

آج کل سب سے بڑا سائنس داں وہ ہے جس نے جوہری توانائی کا انکشاف کیا ہے۔ لیکن اس نے یہ نہ سمجھا کہ یہ توانائی کس نے پیدا کی۔ اگرچہ یہ خوب جانتا ہے کہ وہ اس توانائی کو خود پیدا نہیں کرسکتا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے فطرت کا ایک راز سمجھ لیا۔ اور یہ نہ جانا کہ فطرت اور فطرت کے سارے سامان کو کس نے پیدا کیا ہے۔ میں یہ کہوں گا اور سچ کہوں گا کہ اس نے خلاق عالم کی تخلیق کا ایک راز معلوم کرلیا۔ اگرچہ اس نے اس کی قدر نہ کی اور اس کو نہ جانا کہ کس نے یہ راز پوشیدہ رکھا تھا۔

مجھ کو تو ان مسائل پر غور کرنے میں مزا آتا ہے اور خدا کی قدرت کا علم حاصل کرکے وجد آنے لگتا ہے سائنس دانوں کی تو اس لئے قدر و عزت کرتا ہوں کہ وہ اشیائے عالم کے خواص دریافت کرنے میں منہمک ہیں اور ہم اس سے بے پروا ہیں، ہماری بے پروائی بھی اسی معنیٰ کر بجا ہے کہ ہم نے ایمان کی بدولت تمام اشیا کے بنانے والے کو پالیا۔ مگر قرآن کی ان آیتوں کی طرف توجہ نہیں کی جن میں آیات خداوندی اور آیاتِ قرآنی میں غور کرنے کا حکم صادر ہوا ہے۔

قرآن شریف میں مکرر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ ہم نے ہر چیز کو ایک قدر کے ساتھ پیدا کیا۔ وقد جعل اللّٰہ لکل شیئ قدرًا۔ یعنی اللہ پاک نے ہر شے کے لئے ایک قدر یا وزن خاص بنایا ہے۔ اور ایک جگہ اِنّا کل شیئٍ خلقنٰہ بقدر۔ یعنی میں نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے وزن کے ساتھ۔ سب سے بڑے فلسفی مفسر فخر الدین رازیؒ نے قدر کے معنے لکھے ہیں ایک تو مقدار جس سے مراد لیا ہے جوہر و ارض اور اس کی وضاحت میں تحریر فرمایا ہے والمقدار فی البقا یعنی اس کی زندگی کی مقدار مقرر کی ہے۔ دوسرے معنیٰ تقدیر کے لکھے ہیں۔ تیسرے معنیٰ قضا و قدر لکھے ہیں۔ دوسرے مفسرین نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

علوم آج کل کی طرح پھیلے ہوئے نہ تھے۔ اور نہ آج کی طرح کثرت سے علم کی اشاعت ہوتی تھی۔ آجکل دس گیارہ برس کے بچوں کے لئے ایسا نصاب مرتب ہوا ہے جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز کا ایک وزن خاص ہے۔ یعنی لوہے کا وزن اور ہے، سونے کا اور، پیتل کا اور ہے۔ اور اس کو اس طرح سمجھیں کہ ایک حجم کی چیز اپنا وزنِ خاص رکھتی ہے، لوہے، سونے، پیتل کو ایک حجم کا بنا دیا جائے تو دیکھا جائے گا کہ سب کا وزن الگ الگ ہے۔ مختلف اشیاء کا حجم خاص متعین کرنے کا طریقہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے دو سو برس پہلے سسلی میں ایک شخص آرکیڈس نے معلوم کیا تھا۔

اور اس امر کا انکشاف کیا تھا کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں سب کا اپنا ذاتی وزن متعین ہے۔ اگرچہ وہ ٹھوس ہوں یا سیال ہوں۔

سسلی میں ایک بادشاہ ہیرو نامی تھا جس نے سونے کا ایک تاج بنوایا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ اگر کوئی شخص یہ بتادے کہ اس تاج میں سونا خالص ہے یا اس میں کوئی آمیزش ہے تو اس کو انعام دیا جائیگا اور دربار میں اس کی منزلت کی جائے گی بشرطیکہ تاج کو توڑنا، گلانا یا تپانا نہ پڑے۔ آرک میڈس ایک دن ایک بڑے ٹب میں بیٹھ کر غسل کر رہا تھا۔ اس کو یہ محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا وزن پانی کے اندر کچھ ہلکا معلوم ہوتا ہے کیونکہ پانی اس کو اوپر پھینک رہا تھا۔ چنانچہ اس امر کی جانچ کی کہ کسی رقیق میں کوئی ٹھوس چیز ڈبوئی جائے تو اس کے وزن میں ایک ظاہری کمی ہو جاتی ہے۔ اور یہ کمی اس ٹھوس کے ذریعہ ہٹائے ہوئے رقیق کے وزن کے برابر ہوتی ہے۔ اسی طرح اس نے تاج کو پانی میں رکھ کر اس کی کثافت نوعی نکالی اور اس کا مقابلہ خالص سونے کی کثافت نوعی سے کر کے بتادیا کہ تاج میں کوئی آمیزش نہیں بلکہ خالص سونا ہے۔ کیونکہ اس حجم کا جو وزن تھا وہ سونے کا تھا، نہ کم تھا نہ زیادہ تھا۔ آج بھی اسی طرح جانچا جا سکتا ہے کہ کوئی بنا ہوا زیور خالص سونے کا ہے یا اس میں آمیزش ہے۔ کیونکہ اگر آمیزش ہوگی تو جس حجم کا زیور ہے اس حجم کے سونے سے اس کی کثافت نوعی کم ہوگی۔ زیادہ اس لئے نہ ہوگی کہ سونے سے زیادہ کثافت نوعی جن چیزوں کی ہے وہ عموماً سونے سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں دنیا میں ہر چیز کی قیمت عموماً اس کثافت نوعی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ جس چیز کی کثافت نوعی زیادہ ہے وہ زیادہ قیمتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی قدرت کاملہ کا یہ راز بھی سمجھ لیا جائے کہ اگرچہ قیمت کم ہو پھر بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ اس کو دنیا سے ہٹا دینے کے بعد ضروریات پوری ہو سکیں یعنی ہر چیز ایک مقصدِ خاص کے لئے بنائی گئی ہے۔

الطاف القدس

قسط نمبر ۵

ترجمہ از مولانا محمد کاشف الہاشمی

روحِ ہوائی اور پانچ لطائف

روح ہوائی سے پانچ لطائف پیدا ہوتے ہیں۔ ان لطائف کی پیدائش کا راز یہ ہے کہ دو اجزائے لطیف قائم ہو کر روحِ ہوائی سے متعلق ہو چکے ہیں۔ اور اس پر عشق والفت کے آثار پیدا ہو چکے ہیں لہٰذا ان دونوں اجزاء کے اثرات روحِ ہوائی کے قویٰ کے ساتھ بوقلمونیاں اختیار کرتے ہیں۔ وہ قوت جس کا اصل مرکز جگر ہے اس کو نفسِ شہوی کہتے ہیں جو قوت دل کے لوتھڑے میں مرکوز ہے جس پر تمام اخلاق وملکات کا مدار ہے۔ اس کو قلب کہتے ہیں جس قوت کا مرکز دماغ ہے اور جس کی کارکردگی معقولات، متخیلات اور وہم سے متعلق ہے اس کو عقل کہتے ہیں۔ نفس، قلب، عقل، ان سب کا ٹھکانا روح ہوائی ہے۔ یہ روح ہوائی ہر دو اجزائے لطیف کا اثر یا فیض اسی طرح قبول کرتی ہے جس طرح کسی دریا یا چشمہ کے قرب وجوار کی زمین تری اور نمی قبول کرتی ہے، یا جس طرح بدن باریک باریک رگوں کی مدد پا کر جگر سے تازگی پاتا رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ تینوں قوتیں یعنی نفس، قلب، عقل تین الگ الگ اجزاء سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ نفس روح ہوائی سے، عقل روح سماوی سے اور قلب، نفسِ ناطقہ سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکابر صوفیہ نے قلب اور اس کے تمام شعبوں کو لطیفۂ انسانیہ اور عقل کو زبانِ روح فرض کیا ہے جب ایک سالک کسی قدر روح ہوائی کے غلبہ سے نجات پاتا ہے اور دو لطیف اجزاء سے واسطہ پڑتا ہے تو اس کا قلب، روح اور اس کی عقل سِر کہلاتی ہے۔ قلب اور روح کے درمیان یہ فرق ضرور یاد رکھو کہ قلب روحِ ہوائی کی وہ قوت ہے جو بدن سے پیدا ہوتی ہے، البتہ اس کی تدبیر ہر دو اجزائے لطیف سے ہوتی ہے۔ انھیں کے اثر سے اس میں تازگی آتی ہے۔ اور روح ان میں دو اجزائے لطیف کے اتحاد کا نام ہے۔ یہ روح ہوائی کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ اس پر بقدر ضرورت اعتماد کئے ہوئے ہے۔ ادھر عقل اور سِر کے درمیان یہ فرق ہے کہ عقل، روح ہوائی کی وہ قوت ہے جو یہاں خانۂ دماغ میں خیمہ زن ہے فیضان اور تازگی اس پر بھی انھیں دو اجزائے لطیف کے اثر سے ہے۔ سِر انھیں دو اجزاء کے باہمی اتحاد کا نام ہے۔ یہ بھی روحِ ہوائی کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہے۔ اور بقدر ضرورت اس پر اعتماد بھی

کئے ہوئے ہے۔ یہی سبب ہے کہ روح قلب سے لطیف تر اور سر عقل سے روشن تر ہے۔ قلب کا کام وجد ہے، روح کا کام محبت ہے، عقل کا کام یقین ہے، سر کا کام مشاہدہ ہے۔ ان میں سے دو کے مرتبہ و مقام میں بہت بعد ہے۔ جب سالک روح ہوائی سے بالکل فارغ ہو جاتا ہے اور اس کو ان دو اجزائے لطیف سے واسطہ پڑتا ہے جو پارے کی طرح ایک جان ہو گئے ہیں تو اس وقت سالک سے تین طرح کی حالتوں کا ظہور ہوا کرتا ہے۔

الف :۔ روحِ ملکوت اس کو جذب کرنے لگے۔ روح القدس میں محو ہو جائے۔ پھر محو ہو جانے کے بعد از سرِ نو بقا حاصل کرے اور اپنے وجود کا احساس کرے۔ یہ حالت وراثتِ نبوت ہے

ب :۔ اس کو نفسِ ناطقہ جذب کرنے لگے۔ انانیت کبریٰ میں فنا ہو جائے۔ پھر از سرِ نو زندگی حاصل کرے اور اپنے وجود کو پالے۔ یہ حالت ولایت کبریٰ کہلاتی ہے۔

ج :۔ دونوں حالتیں (نفس ناطقہ اور روحِ ملکوت) بیک وقت مکمل طور پر اسے حاصل ہو جائیں۔ یہ حالت جمع الجمع کہلاتی ہے۔ اس حالت کو پالینے والا دو طرح سے متعارف ہوا کرتا ہے، کبھی تو نفس کلیہ اور انانیت کبریٰ کا فیضان اس پر پڑتا ہے۔ کبھی دل کی پوشیدہ رگوں کے ذریعہ فیض روح القدس اور احساساتِ ملاءِ اعلےٰ سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مجھے اس آخری حالت سے نسبت ہے۔

ووراء ذلك ذالٍ فلا اقول لانه   سر، لسان النطق عنه اخرس[له]

(اس کے بعد کیا ہے؟ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک سربستہ راز ہے کہ تاب گویائی مفقود ہے۔)

[له] شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہٗ کیا فرما رہے ہیں ؎

کہاں کہاں سے گزارا ہے شوق نے مجھ کو   بس اک مقام بچے گا اگر شمار کروں۔

کاشف

افادات اکابر

قدرت کے کرشمے

از حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

وہ کیا چیز ہے جس نے ہم کو خدا کے ماننے پر مجبور کیا؟

جب ہم مکونات میں مختلف افعال و آثار دیکھتے ہیں تو بعض ان میں سے ایسے ہیں کہ جن کو ہم کسی سبب کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ مثلاً بیمار نے دوا پی، اچھا ہوگیا۔ یہ صحت یابی دوا کی طرف منسوب ہوگی۔ چھت گری اور اس کے نیچے کوئی دب کر مر گیا۔ بجلی گری اور کوئی شخص جل گیا۔

اور بعض ایسے ہیں جن کو کسی سبب کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ جیسے کسی پر بجلی گری مگر نہیں مرا۔ یا چھت گری مگر وہ زندہ نکلا۔ اس قسم کے واقعات کو کسی سبب پر محمول نہیں کرتے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ محض خدا کی قدرت سے ایسا ہوا۔ کیونکہ یہاں بظاہر اسباب کا سلسلہ اس واقعہ کے مخالف تھا۔ چاند سورج کو گہن لگتا ہے اس کا سبب بیان کیا جاتا ہے، بارش برستی ہے اس کا سبب بیان کرتے ہیں۔ لیکن اسباب کا سلسلہ ضرور کہیں نہ کہیں مجبوراً بند کیا جاتا ہے۔ اور وہاں پہنچ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ چیزیں قدرتی ہیں۔ غرض قدرتی چیزیں وہ کہلاتی ہیں جن کا بنانا تمام مخلوق کی قدرت سے باہر ہے اور جس کو دیکھ کر لامحالہ ایک قادرِ مطلق کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے ایسی اشیاء کے وجود سے اپنے وجود پر استدلال فرمایا ہے۔ قرآن عزیز میں فرماتے ہیں:-

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَّتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ ۝

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے ادل بدل میں اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزیں (مال تجارت وغیرہ) سمندروں میں لے کر چلتے ہیں اور مینہ میں جو اللہ آسمان سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرے پیچھے دوبارہ زندہ کرتا ہے اور ہر قسم کے جانوروں میں جو خدا نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھیرنے میں اور بادلوں میں جو خدا کے حکم سے آسمان و زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں (غرض ان سب چیزوں میں) اُن لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں بہتیری نشانیاں موجود ہیں۔

آسمان اور جو سیارات اس میں ہیں جیسے چاند اور سورج وغیرہ، ان سب کا وجود قدرتی ہے۔ ان کی پیدائش کو کسی مخلوق کا فعل نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے مثل بنانے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔

زمین ہے کہ جس سے ہر قسم کی غذائیں اور رنگ برنگ کے پھول پھل نکلتے ہیں، کسی کی طاقت نہیں کہ ایک ٹکڑا اس جیسی زمین کا بنا دے۔ سورج ایک معین اور مضبوط نظام کے ماتحت ہمیشہ دن کو نکلتا ہے اور شام کو غروب ہو جاتا ہے۔ کسی کی کیا طاقت ہے کہ اس کو ایک منٹ یا ایک سکنڈ کے لئے روک لے۔ ہوا ہے کہ اس پر کسی کا قابو نہیں، انسان چاہتا ہے کہ پچھوا چلے مگر پروا چلتی ہے، سارا جہان مل کر پانچ منٹ کے لئے بھی پچھوا نہیں چلا سکتا۔ پانی کے بھرے ہوئے بادل کڑکتے اور گرجتے ہوئے نکل جاتے ہیں مگر کسی کو اختیار نہیں کہ بارش حاصل کر سکے۔ زمین و آسمان کے درمیان بادل لٹکا ہوا ہے، کسی کی طاقت نہیں کہ دو قطرے لے سکے۔ اور جب برستا ہے تو کسی کی قدرت نہیں کہ روک سکے۔ جب ان امور کو انسان دیکھتا ہے اور عاجز ہو جاتا ہے تو قدرت کو ماننا پڑتا ہے، طوفان خیز سمندر میں جہازوں کا چلنا، ہواؤں کا ادل بدل یہ سب چیزیں کسی کے قبضہ میں نہیں۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝

اور سورج ہے کہ چلا جا رہا ہے اپنے ٹھکانے کی طرف۔ یہ اندازہ ہے زبردست حکیم کا باندھا ہوا۔ اور چاند ہے کہ مقرر کر دی ہیں ہم نے اس کی منزلیں یہاں تک کہ پھر لوٹ کر رہ جاتا ہے کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح، نہ تو سورج کو یہ لائق ہے کہ وہ جا پکڑے چاند کو اور نہ رات (کی مجال) ہے کہ وہ آجائے دن (ختم ہونے) سے پہلے۔ اور ہر سیارہ اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے۔

یہ سب اس لئے ذکر کیا گیا کہ آپ سمجھ لیں کہ خدائی کام اور انسانی کاموں میں کس طرح تمیز ہوتا ہے خدائی کام وہ کہلاتا ہے کہ اس جیسا کرنے سے سب مخلوق عاجز ہو۔ ازل و ابد کے انسانوں کو ملاؤ لیکن کوئی نہ کر سکے۔

یہی استدلال ابراہیم علیہ السلام نے بھی کیا تھا۔ پہلے حیات اور ممات کے متعلق سوال کیا۔ جب اس میں مخاطب (نمرود) کی عبادت دیکھی تو فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ۔ میرا رب ایک قاعدہ سے، ایک ضابطہ سے شمس کو چلاتا ہے، خدائی کام وہ کہلاتا ہے کہ دنیا میں اس کا مقابلہ کوئی طاقت نہ کر سکے۔

آئینۂ سیرت

صحابہ رضؓ کرام کی تبلیغی خدمات

(مولانا محمد عبداللہ صاحب فاضل دیوبند)

گذشتہ سے پیوستہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے عزم و استقلال اور اپنی دوربینی اور روشن ضمیری سے اسلام کو دوبارہ زندہ کیا اور نئے سرے سے اسلام کا غلغلہ بلند کیا اور صحابہؓ کے لیے اسلام کی تبلیغ کا راستہ صاف کر دیا۔ یہ واضح رہے کہ فتنۂ ارتداد کی آگ بجھنے اور سکون و اطمینان کی ہوا چلنے کے بعد ہی نئے سرے سے صحابہ کرام تبلیغ اسلام میں مشغول ہوئے۔ اس لحاظ سے دنیائے اسلام پر سب سے زیادہ جس کا احسان ہے وہ صدیق اکبرؓ کی ذات گرامی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عوام کی آسانی کے پیش نظر ایک طرف قرآن کے متفرق اجزاء کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دیا تو دوسری طرف ایک افتاء کا محکمہ قائم فرمایا جس کی خدمت کے لیے اجلہ صحابہ مامور تھے۔ جیسا کہ طبقات ابن سعد کی روایت سے پتہ چلتا ہے۔

انّ ابابکر الصدیق کان اذا نزل بہ امر یرید فیہ مشاورۃ اھل الرای واھل الفقہ و دعا رجالا من المہاجرین والانصار دعا عمر، عثمان، وعلیا وعبد الرحمن بن عوف ومعاذ بن جبل وابی بن کعب وزید بن ثابت کل ھؤلاء یفتی فی خلافۃ ابی بکر۔ الخ۔

جب کوئی امر پیش آتا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ اہل الرائے و فقہائے صحابہ سے مشورہ لیتے تھے۔ اور مہاجرین اور انصار میں سے چند ممتاز لوگ یعنی عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمنؓ بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زیدؓ بن ثابت کو بلاتے تھے۔ یہ سب حضرات ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں فتوے بھی دیتے تھے۔

اگر تبلیغ کو محدود نہ کیا جائے تو یہ خدمت بھی تبلیغ کی ایک فرع ہو سکتی ہے[1]

---

[1] کیونکہ لفظ تبلیغ عام ہے جس کے معنی پہنچانے کے ہیں، ہر وہ قول جو شریعت سے متعلق ہو اور بلغوا عنی ولو بآیۃ کے تحت میں آتی ہو۔ افتاء کی صورت میں بھی پہنچایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ صحابہ کا علمی نقشہ ہمارے سامنے ہے۔ جو لوگ لفظ تبلیغ کو صرف عموم پھر کر دی رسائی تقریر کرنے اور ایک خاص ہیئت کذائی کے ساتھ دین کی باتیں بتلانے پر محمول کرتے ہیں اور با ضابطہ (باقی اگلے صفحہ پر)

عہد صدیقی میں جس قدر لڑائیاں پیش آئیں اور صدیق اکبرؓ نے دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں جو فوجیں روانہ فرمائیں، آپ کی طرف سے امیر لشکر کو ہدایت تھی کہ غنیم کو سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کریں۔ علاوہ ازیں آس پاس، اردگرد جو قبائل عرب آباد ہیں ان میں بھی دین متین کی تبلیغ اور اشاعت کریں۔ اس ہدایت پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مثنیٰ بن حارثہ کے ذریعہ بنی وائل جو بت پرست اور کچھ عیسائی تھے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اور حضرت خالد بن ولید کی دعوت اسلام پر حدود شام، عرب اور عراق کے اکثر قبائل عرب اسلام سے مشرف ہوئے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مرتدین میں سے بہتوں نے پھر سے اسلام کو اپنایا۔ اور طلیحہ اسدی، عمرو بن معدی کرب جو نبوت کا دعویٰ کرتا تھا شام پہنچ کر تائب ہوا۔ اور حضرت صدیق اکبر کی خدمت میں معذرت کے طور پر یہ شعر لکھ کر بھیجے تاکہ اس کو مدینہ آنے کی اجازت مل جائے۔

هل يقبل الصديق انى مراجع　　　وبما احدثت من حدث يداى

کیا صدیق اکبر اس کو قبول کریں گے کہ میں لوٹ آؤں اور میرے ہاتھوں نے جو جرائم (گناہ) کئے ہیں ان کی تلافی کروں۔

وانى من بعد الضلالة شاهد　　　شهادة حق لست فيها بملحد

اور ضلالت (گمراہی) کے بعد شہادت (گواہی) دیتا ہوں ایک ایسی حق کی شہادت کہ میں اس سے کنارہ کش ہونے والا نہیں ہوں۔

اب غور کرنے کی بات ہے کہ وہی لوگ جو اسلام کی مخالفت پر آمادہ اور مسلمانوں کی بیخ کنی کو اپنا فرض سمجھتے تھے جب وہ ارتداد اور دعویٰ نبوت سے تائب ہوئے تو خود ہی اشاعت اسلام میں مشغول ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ صدیقی خلافت کے کارناموں میں شمار ہے۔ اب ہم حضرت حسان بن ثابت کے ایک قصیدے پر حضرت ابو بکرؓ کے تذکرہ کو ختم کرتے ہیں۔

اذا تذكرت شجوا من اخى ثقة　　　فاذكر اخاك ابابكر بما فعلا

جب تمہیں کسی سچے بھائی کا غم یاد آئے تو اپنے بھائی ابو بکر کو ان کے کارناموں کی بنا پر یاد کرو۔

خير البرية اتقاها واعدلها　　　بعد النبى واوفاها بما حملا

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد تقویٰ اور عدل کے لحاظ سے وہ تمام مخلوق میں سب سے بہتر تھے اور انہوں نے جو کچھ اٹھایا اس کو پورا کر کے چھوڑا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) قرأت قرآن، تعلیم حدیث وغیرہ کو دائرۂ تبلیغ سے خارج سمجھتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا نظریہ ہے جو بعید از تحقیق ہے۔ یا یوں کہا جائے ؎

وللناس فيما يعشقون مذاهب　　　محمد عبد اللہ قاسمی

والثانی التالی المحمود مشهده   واول الناس منهم صدق الرسلا

وہی ثانی اور آپ کے بعد متصل ہیں جن کی مشکلات میں موجودگی کی تعریف کی گئی ہے۔ اور وہی پہلے
ص ہیں جنھوں نے رسولوں کی تصدیق کی ہے۔

ضرت عمر فاروقؓ آپ اسلام سے پہلے قریش کی طرف سے بیرونی ممالک کی سفارت کرتے تھے
بڑے قابل، دلیر، معاملہ فہم اور تجربہ کار تھے۔ جوں ہی مکہ کی گھاٹیوں سے
الا اللہ محمد رسول اللہ کی صدا بلند ہوئی اور حضرت عمر کے کانوں سے ٹکرائی تو انھیں یہ آواز
ی اجنبی محسوس ہوئی اس لئے بڑے برہم ہوئے۔ اور ایک عرصہ تک اس آواز کو بند کرنے اور اس
یک کو دبانے میں نہایت سرگرمی سے پیش پیش رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام دشمنی اور طاقت میں حضرت
ور ابوجہل بن ہشام مشہور تھے جس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے
اہ رب العزت میں دعا فرمائی تھی کہ :۔

اللّٰھم اعز الاسلام باحد الرجلین اما ابن ھشام و اما عمر بن الخطاب

اے اللہ ابوجہل یا عمر بن خطاب سے جو تیرے نزدیک محبوب ہو اس سے اسلام کو عزت دے۔

ر بقول ابن عساکر، جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوا کہ یہ دولت قسام ازل نے
ہل کی قسمت میں نہیں لکھی ہے تو اس وقت آپ نے خصوصیت سے حضرت عمر کے لئے یہ دعا فرمائی :۔

اللّٰھم اید الاسلام خاصۃ بعمر بن الخطاب

خدایا اسلام کو خاص عمر بن خطاب سے قوت دے۔

اس دعائے مستجاب کا اثر یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد اسلام کا سب سے بڑا دشمن دار ارقم (حضورؐ
قیام گاہ) پر پہنچا۔

اس وقت بھی آنحضرتؐ نے ایک روایت کے مطابق یہ دعا فرمائی :۔

اللّٰھم ھذا عمر بن الخطاب اللّٰھم اعز الدین بعمر بن الخطاب

اے اللہ یہ عمر بن خطاب حاضر ہے۔ اے اللہ اس سے اپنے دین کو عزت دے۔

اس دعا کو حق تعالیٰ نے شرف قبولیت بخشا اور حضرت عمر کا دامن دولت ایمان سے بھر دیا۔ اس واقعہ سے
رت عمر کی امتیازی شان ظاہر ہوتی ہے، وہ یہ کہ حق تعالیٰ کے نزدیک آپ کی پسندیدگی کے ساتھ اسلام کی
ت اور تقویت آپ کی ذات عالیہ سے وابستہ کر دی گئی تھی جس کا ظہور اسلام لاتے ہی شروع ہوا اور اسلام کی
یخ کا ایک نئے باب اور نئے دور سے آغاز ہو گیا۔ مسلمان پہلے چھپ چھپ کر فرائض مذہبی ادا کرتے تھے اب

؎ اپنی کتاب "مظلوم صحابہ" میں حضرت سعید بن زید اور فاطمہ اخت عمر کے واقعہ کے ضمن میں اس واقعہ
ذکر کیا ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

علانیہ حرم میں نماز پڑھنے لگے۔ پہلے خفیہ طور سے اسلام کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ حضرت عمر کے اسلام لانے سے دفعتاً حالت بدل گئی یعنی یہ کہ کھلم کھلا تبلیغ کی جانے لگی۔ اسی روز سے حق اور باطل کا فرق ظاہر ہوا اور اس صلہ میں حضرت عمر کو بارگاہِ رسالت سے فاروق کا لقب ملا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کی شان میں ارشاد گرامی ہوا

لو کان بعدی نبی لکان عمر بن الخطاب

یعنی تو نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ لیکن بالفرض میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر نبی ہوتے۔ اس لئے کہ ان میں نبوت کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے حضرت عمر میں وہ قوت پیدا ہو گئی تھی جس سے دنیا کو اپنا گرویدہ اور اسلام کا شیدا بنا سکیں۔ چنانچہ آپ کے زمانۂ خلافت میں جس قدر اسلام پھیلا اور فتوحات ہوئیں یہ بات کسی اور کے دورِ خلافت میں اس شان اور انداز کی نہیں ملتی۔ ظاہر ہے، یہ سب کچھ حضور پُرنور صلے اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت کا نتیجہ تھا۔

جہاں تک آپ کی تبلیغی خدمات کا تعلق ہے اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروق کو بہت انہماک رہا ہے۔ آپ کے زمانہ میں نہایت سرعت سے اسلام کے پھیلنے اور اقلیموں کو مسخر کر لینے میں زیادہ تر آپ کے اوصاف اور محاسنِ اخلاق کو دخل تھا۔ اسی طرح آپ نے اسلامی فوجوں کو اخلاق کا نمونہ بنایا تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ روم کا سفیر اسلامی سپہ سالار کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کی سادگی، خدا پرستی، دینداری، راستبازی کو دیکھ کر خود بخود اسلام کی طرف مائل ہوا اور مسلمان ہوا۔ اس کر بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے طرزِ معاشرت اور حالات ہی کو سن کر مصر کا ایک سردار نہ صرف خود مسلمان ہوا بلکہ اس کی بدولت دو ہزار کی جمعیت بھی اسلام حلقہ بگوش ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ تبلیغ میں صرف زبانِ قال ہی کافی نہیں، بلکہ زبانِ حال ———— کی بھی ضرورت ہے۔ بہرحال حضرت عمر نے تبلیغ کے لئے زبانِ قال اور زبانِ حال دونوں کو استعمال کیا ہے چنانچہ قبائلِ عرب جو عراق اور شام میں آباد ہو گئے تھے ان میں سے اکثر آپ کی معمولی ساعی جمیلہ سے اسلام میں داخل ہوئے۔ ایک طرف آپ نے مذہبی تعلیم یعنی قرآن، حدیث، فقہ، فتویٰ کا ایک مرتب اور منظم سلسلہ قائم فرمایا تو دوسری طرف اس کا التزام فرمایا تھا کہ جب کسی لشکر کو محاذ پر روانہ کرنا ہوتا تو اس کا سردار ایسے شخص کو بناتے تھے جو صاحب علم اور صاحب فقہ ہوتا کہ وہ سب سے پہلے تلوار کے بجائے کلمہ پیش کرے اور اسلام کی تبلیغ کر سکے۔

حضرت عمر فوجی افسران کو خطوط لکھتے تو اسی اندازہ کے ہوتے تھے کہ خبردار پہلے تلوار استعمال نہ کرنا۔ جہاں تک ہو سکے اسلام کی ترغیب دینا جیسا کہ سعد بن ابی وقاص کو لکھا وقد کنت امرتک ان تدعو من لقیت الی الاسلام قبل القتال۔

چنانچہ انہوں نے ایرانیوں اور عیسائیوں کے پاس جو اسلامی سفارتیں بھیجیں انہوں نے بڑی خوبی اور حسن سے اسلام کی تبلیغ کی۔ مثال کے طور پر یہاں ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں تھے، اپنی جرأت وشجاعت کے لحاظ سے بڑے رتبہ کے صحابی تھے حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ایک بڑے لشکر کے سپہ سالار بنائے گئے تھے۔ جب ساسانیوں[1] کا مقابلہ کرنے کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے اور منازل طے کرتے ہوئے قادسیہ پہنچے جو کہ کوفہ سے ۳۵ میل پر ایک چھوٹا مگر شاداب اور پُرفضا شہر تھا اور جہاں سے ساسانیوں کا پایہ تخت مدائن تیس چالیس میل پر تھا۔ انھیں —— —— یہ پتہ چلا کہ رستم زماں ساٹھ ہزار کی جمعیت لے کر ساباط میں جو (قادسیہ سے چند میل پر تھا) ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے تو اس بات کی اطلاع حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بھیجی۔ وہاں سے قاصد یہ جواب لے کر آیا:-

لا یکربنک ما یاتیک عنہم واستعن باللہ وتوکل علیہ وابعث الیہ رجالا من اہل المناظرۃ والرای والجلد یدعونہ فان اللہ جاعل دعاءہم توہینا لھم۔ یعنی تم ان کے ساز وسامان سے گھبراؤ مت اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو اور اسی پر بھروسہ رکھو شاہ فارس کے پاس چند ذی رائے اور بہادر لوگ دعوت اسلام کے لئے بھیجو۔ انشاء اللہ اس دعوت سے ان کے ارادوں میں سستی پیدا ہوگی۔

اس حکم کی تعمیل میں حضرت سعد نے چودہ نامورانِ عرب کا انتخاب کیا جو رعب اور دبدبہ اور قد وقامت اور عقل وسیاست میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ یہ سفراء اسلام جب مدائن پہنچے تو اس شان سے کہ عربی جبوں میں ملبوس، کاندھوں پر یمنی چادریں، ہاتھوں میں کوڑے اور گھوڑے اڑاتے ہوئے تو دیکھنے والوں پر ایک رعب اور ایک اثر پڑتا تھا۔ ان کی آمد کی اطلاع شاہ فارس کو ہوئی تو اس نے دربار کو خوب سجا کر انھیں طلب کیا اور آنے کا سبب پوچھا یہ حضرات شانِ بے نیازی سے دربار میں داخل ہوئے اور دلیری اور بے باکی سے اسلام کے اجمالاً حالات بیان کئے اور کہا۔ جو اسلام کی دعوت قبول کرے وہ جملہ حقوق میں مساوی ہے اور جو اسلام کی دعوت منظور نہ کرے لیکن جزیہ دینے پر رضامند ہو تو وہ اسلام کی حمایت میں ہے اور جس کو دونوں باتیں ناپسند ہوں تب اس کے لئے تلوار ہے۔

شاہ فارس اپنی بادشاہت کے نشہ میں اس بات کو برداشت نہ کرسکا۔ آگ بگولا ہوگیا اور مٹی کا ایک ٹوکرا منگوا کر پوچھا کہ بتاؤ تم میں سب سے زیادہ معزز کون ہے

عاصم بن عمرو نے آگے بڑھ کر کہا۔ میں ہوں۔ شاہی ملازموں نے ان کے سر پر ٹوکرا رکھ دیا۔ یہ حضرات اس چیز کو نیک فال سمجھے اور حضرت سعد کی خدمت میں پہنچ کر کہا۔ لیجئے خود دشمن نے اپنی زمین ہمارے حوالے کردی۔ فتح مبارک ہو۔

(باقی آئندہ)

[1] حکومت فارس کے چوتھے دور کو ساسانی کہا جاتا ہے ۱۲

ابن سعود اور فتح ریاض

(قسط نمبر)

ابن سعود نے اب اپنا لشکر جمع کرنے کی طرف توجہ کی۔ اس کے اپنے آدمی تو بہت کم تھے، سارا لشکر جو یہ جمع کر سکا وہ ایک ہزار آدمیوں کا تھا۔ اور یہ بھی بڑی مشکل سے قبائل کے دلوں میں جوش ڈال کر مہیا ہوا۔ اس لشکر کو لے کر وہ چکر دیتا ہوا الدلم شہر کے جنوب و مغرب میں الحوطہ گاؤں میں آگیا۔ یہاں پہنچ کر سہ پہر کے وقت اس کو یہ اطلاع ملی کہ رشید نعجان گاؤں میں ہے اور صبح ہی وہ الدلم پر حملہ کر دے گا۔

اب وقت آرام میں نہیں کھویا جا سکتا تھا۔ یہاں سے الدلم تک انہیں ستر میل کی مسافت طے کرنی تھی اس لئے وہ فوراً چل پڑا اور ارادہ کیا کہ صبح صادق سے پہلے شہر میں داخل ہو جائے۔ مخبروں کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ پچھم کی طرف جا رہا ہے۔ مگر وہ جبل طویق کی آڑ میں ہو کر سیدھا شمال کی سمت چلا۔ وہ برابر اپنے آدمیوں کو تیزی سے چلنے کے لئے تاکید کرتا تھا اور خود سب سے آگے اپنے اونٹ کو تیزی سے چلائے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ تاریکی کی وجہ سے اس کے اونٹ کا پاؤں پھسلا اور وہ بیٹھ گیا۔ پیچھے سے جو سوار آ رہے تھے وہ ٹھوکر کھا کر اس کے اوپر گرے اور ان کے پیچھے جو سوار آئے وہ ان پر آ گرے۔ اب قافلے میں انتشار ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی ایک حلقہ بنا کر لوگوں نے گرے ہوئے آدمی اور اونٹوں کو اٹھا لیا اور کسی نے ابن سعود کو بھی کھینچ کر نکال لیا۔ لیکن اس کے چوٹیں بہت آئیں اور وہ درد کی تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں ہوش آیا تو وہ پھر اونٹ پر سوار ہوا اور پھر اسی تیزی سے چلا۔ اس طرح یہ لوگ گرتے پڑتے رات کے آخری حصہ میں الدلم کے شہر تک پہنچ گئے۔ شہر کے شمال کے رخ کھجوروں کا ایک جنگل تھا۔ اس میں ابن سعود نے اپنے لشکر کے ایک ہزار آدمی جگہ جگہ پھیلا دیئے اور پھر شہر میں داخل ہو کر اس نے محافظوں سے کہا کہ دروازے بند کر لیں اور کچھ آدمی دروازوں پر رہیں اور باقی شہر پناہ پر پہرہ دیں۔

اس کے بعد وہ بے ہوش ہوگیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا سات روز سے دن رات سفر کرتا رہا تھا۔ اور ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا تھا۔ کھانا بھی کچھ نہیں کھایا تھا بمشکل سے شاید چند چھوارے منہ میں ڈال لئے ہوں۔ جب وہ بے ہوش ہوا تو اس کے محافظ اسے ایک گھیرے میں لے آئے جہاں اس کے بدن پر تیل کی مالش کرکے اس پر کمبل ڈال دیا۔ وہ اسی طرح سوتا رہا۔ یہاں تک کہ ظہر کی نماز کے لئے اذان کی تکبیر کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اس وقت وہ جاگا۔ اس کا تمام بدن چوٹ اور مسلسل سفر کے تکان کی وجہ سے اکڑ گیا تھا۔ تاہم تیل کی مالش اور نیند نے اس کو تازگی بخشی اور وہ اب پھر چاق چوبند ہوگیا۔

وہ اب اپنے لشکر میں آیا۔ اسی وقت رشید کے ہراول دستے بھی جن کے پیچھے بڑا لشکر تھا آتے نظر آئے۔ ابن سعود نے اپنے لشکر میں یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی شخص ذرا بھی جنبش نہ کرے اور دشمن پر ہرگز یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ درختوں میں کوئی فوج چھپی ہوئی ہے۔ جب ہراول دستے درختوں کے قریب آئے تو ابن سعود نے ان پر رائفل سے چند گولیاں چلائیں جس سے چار گھوڑے اور چھ سوار مارے گئے، باقی جو بچے وہ پیچھے کو بھاگ گئے۔ رشید نے اور آدمی بھیجے لیکن جب یہ بھی گولیوں کا نشانہ بنے اور آگے نہ بڑھ سکے تو اس نے خیال کیا کہ یہ گاؤں کے لوگ نہیں ہیں بلکہ کوئی باقاعدہ فوج ہے جو گولیاں چلا رہی ہے۔

باقی دن میں اور اگلے دن بھی اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس فوج کی تعداد کتنی ہے اور اس کے دستے کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس غرض سے اس نے جنگل کے قریب جگہ جگہ آدمی بھیجے لیکن ابن سعود نے اپنے آدمیوں کو باہر نکلنے سے باز رکھا۔ اس نے جنگل کے مختلف حصوں میں قبائل کے لشکر کے آدمیوں کو تقسیم کر دیا تھا اور ان سے کہہ دیا تھا کہ سوائے اس وقت کے کہ کوئی ان پر حملہ کرے وہ ہرگز گولی چلانے میں پہل نہ کریں۔ اور اس وقت بھی صرف مدافعت کے لئے چند لوگ گولیاں چلائیں۔ وہ ہرگز اپنا سراغ دشمن کو نہ لگنے دیں۔ رشید کو صرف اتنا ہی پتہ چلے کہ اس کے مقابلے میں تھوڑی سی ہی تعداد مسلح آدمیوں کی ہے۔

وہ الدلم میں آیا ہی تھا اور کھانا کھانے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ بگل بجا۔ دشمن کھلے میدان میں دو صفوں میں بڑھ رہا تھا۔ رشید نے اس مقابلے سے ناراض ہوکر یہ مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ اس مزاحمت کو صاف کرتا ہوا شہر پر حملہ آور ہوگا۔ ابن سعود فوراً اپنے لشکر میں آگیا۔ رشید چلا آرہا تھا۔ اس کا فوجی علم آگے آگے تھا جو لہرا رہا تھا۔ پیدل دستے بیچ میں تھے، دائیں بائیں سوار تھے جو اپنی تلواریں چمکاتے اور اپنی بہادری کے ترانے پڑھتے چلے آرہے تھے۔

رشید کا لشکر سامنے تھا۔ مگر اب بھی ابن سعود نے گولیوں کی باڑھ نہ چلائی۔ اس کا اپنے آدمیوں کو

روکے رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ رجز خوانی سن کر ایک عرب سپاہی کے لئے خاموش رہنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے آدمی جوش سے مضطرب ہو رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں لیکن ابھی دشمن کے لشکر کا بڑا حصہ زد میں نہیں آیا تھا۔ اس لئے اس نے انھیں رُکے رہنے پر مجبور کیا۔ جب دشمن بالکل قریب آگیا تو اس نے ایک ساتھ اس پر باڑھ مارنے کا اذن دیا۔ فوری طور پر گولیوں کی بوچھاڑ جو پڑی تو لشکر میں بے ترتیبی پھیلی، صفیں ٹوٹیں اور سوار اور پیدل سب کے پاؤں اکھڑ گئے۔ رشید تو اس خیال میں آگے بڑھا تھا کہ کوئی چھوٹی سی ٹولی درختوں میں چھپی ہوئی ہے۔ جو چند گولیاں چلائے گی، مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا نکلا، وہاں تو اولوں کی طرح گولیاں برسنے لگیں۔ جب رشید کا لشکر تھوڑی دور ہٹ کر پھر رُکا تو ابنِ سعود بھی فوراً ہی اپنے ایک ہزار جانبازوں کو لئے ہوئے شیر کی طرح دہاڑتا ہوا ان پر آگیا۔ دشمن کا لشکر اس آسمانی گولے کی تاب نہ لا سکا، پسپا ہوا، بھاگ کر ٹوٹی صفیں تمام منتشر ہوگئیں۔ اور ایک بھگدڑ مچ گئی۔ ابنِ سعود ان کے پیچھے اپنا لشکر لئے باقاعدہ ان پر گھیرا ڈالتا چلا جا رہا تھا۔ اور جو ٹولیاں اِدھر اُدھر ہو جاتی تھیں ان کو اس کے آدمی گرفتار کرتے اور آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ الدلم کے نواح کے گاؤں والے بھی ساتھ ہو گئے۔ اور انہوں نے بھی دشمن کے جو آدمی ملے ان کو تہ و بالا کر دیا۔ رشید آگے آگے جا رہا تھا اور اس کا بچا کھچا لشکر تتر بتر ہو کر اس کے پیچھے دوڑتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ریاض کے شہر سے بھی آگے نکل گیا۔ اس وقت ابنِ سعود نے ان کا پیچھا چھوڑا۔

اس عظیم الشان فتح کی خبر سرعت سے تمام ریگستانی قبائل میں پہنچی۔ الافلاق اور الحرج کے صوبوں کے سب قبیلے رشید سے علی الاعلان باغی ہو کر ابنِ سعود کے مطیع ہو گئے۔ جنوبی نجد کا تمام ملک اب اس کے ساتھ تھا۔ سعود اعظم کے بعد اب یہی ایک بڑی فتح ایسی تھی جو ایک سعودی نے اپنے قدیمی طاقتور دشمن ابنِ رشید کو جو بڑا لشکر لے کر آیا تھا، شکست دے کر حاصل کی۔

حضرت نانوتوی کی وفات پر

سرسیّد مرحوم کے تاثرات

یہ مضمون "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" مورخہ
۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا ——

افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی) نے پندرہ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری
میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رو دیا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لئے
رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آئے نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ
دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی
نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے
کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی
اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب
کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ!
بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے
انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتداء ہی سے آثار تقویٰ اور ورع
اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع و اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا:

بالائے سرش ز ہوشمندی * می تافت ستارۂ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی
اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے، جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت
نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے ان کے دل
کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا، خود بھی پابند شریعت اور سنت تھے اور اور لوگوں کو بھی پابند شریعت
و سنت کرنے میں از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انھوں نے

ش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت
داس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے، وہ کچھ خواہش
بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان
اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔ مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں
وہ ناراض تھے مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو یا
سے خوشی کا ہو کسی طرح ہوائے نفسانی یا عناد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے، ان کے تمام کام اور افعال
قدر کرتے تھے بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی
ی کرتے تھے، ان کا کسی پر ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے
سی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ
ے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے خدا کے واسطے برا جانتے تھے۔

ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے
لیسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے
ہم کہتے تھے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی
شاہ عبد العزیزؒ سے کچھ کم ہو، الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھکر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں
ن کا پایہ اگر مولوی محمد اسحاق سے بڑھکر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے
تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت
ۓ اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت
ہر کرتی ہے، ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ نے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند
یہ حسرت و افسوس کے کہکر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو آنکھ سے بہاکر اور رومال سے پونچھکر چہرہ صاف
یں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگاری کو قائم رکھیں۔ دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری
اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے
م قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

(۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء، صفحہ ۴۷۷ و ۴۷۸)

نقد و نظر

خطبات حکیم الامت
تسہیل دعوات عبدیت حصہ اول

سلسلۂ مواعظ حضرت تھانوی رح۔ ناشر ادارہ اشرف المواعظ، دیو بند۔
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۴ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ پچھتر نئے پیسے۔

ایک دور تھا جب لوگ لذتِ کام و دہن کے لیے نہیں استفادہ و استفاضہ کی خاطر مجالس وعظ میں شریک ہوتے تھے اور واعظین بھی نطق و بیان کی داد لینے کی سطح سے بلند ہو کر محض اصلاح خلق و اظہارِ حق کے تحت عامۃ المسلمین کو ہدایت و نصیحت سے فیض یاب کرتے۔ یہ لوگوں کا مشاہدہ اور بیان کرنے والوں کا تجربہ ہے کہ آج سے چالیس برس قبل وعظ کہنے والے اور وعظ سننے والے زبان کے چٹخاروں سے ناآشنا تھے۔ سامعین جب مجلس وعظ سے اٹھتے تو ان کے بجھے ہوئے دلوں میں واعظ کا سوز اندروں انفعال و تأثر کی انگیٹھیاں دہکا دیتا۔ حضرت تھانوی رح کے مواعظ بلاشبہ اس چودھویں صدی میں شیخ عبد القادر جیلانی رح اور محدث بغداد ابن جوزی رح کے مواعظ کی یاد تازہ کراتے ہیں۔ ان کے مواعظ لفظ و بیان کی نمائش نہیں تھے۔ فی الحقیقت چلتی پھرتی خانقاہیں تھیں جن میں بیعت ارشاد کے رسمی تعلق کے بغیر لوگوں کی اصلاح ہوتی تھی۔ بگڑے سے بگڑے سنور جاتے تھے، ہر طبقے کے لوگوں کے لئے حضرت تھانوی رح کے مواعظ میں دعوت اصلاح ہے۔ اور ہر اخلاقی و روحانی بیماری کا نسخہ موجود ہے۔

اب وہ مجلسیں اکھڑ چکی ہیں۔ واعظین بے شمار ہیں مگر زبان کے اخلاص اور دل کے سوز سے محروم، سامعین بہت ہیں پر قلب خاشع اور گوش توجہ سے خالی۔ اب مواعظ محض اظہارِ سخن کا معیار اور ایک ذہنی تفریح بن کر رہ گئے۔ آج وعظ داد طلب نکتہ آفرینیوں کی مجلس ہے۔ یا ز رطلب سخن سنجیوں کی نمائش یا پھر امت مسلمہ کی وحدت کو آگ دے دینے والی لفظی بارود۔ الا ماشاء اللہ

حضرت تھانوی رح کے مواعظ میں لفظ و بیان کی عصمت، فکر و نظر کی تقدیس، اخلاص و احسان کا آہنگ اور اصلاح و تبلیغ کا وہ گداز ہے کہ ہر شخص جو طالب اصلاح ہو ان میں اپنی روحانی و اخلاقی شفا کا سامان پا سکتا ہے ادھر کچھ دنوں سے یہ سلسلۂ مواعظ پھر شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ چنانچہ ادارہ اشرف المواعظ نے اس عظیم خدمت کا بار اپنے سر لیا ہے کہ حضرت تھانوی رح کے وہ تمام مواعظ اور تصانیف جو نایاب ہیں دوبارہ سلیقے کے ساتھ چھاپ کر امت کے سامنے پیش کرے۔

دعوات عبدیت ایک بہت مفید اور اہم سلسلۂ وعظ ہے۔ ادارہ نے اسی سے مواعظ کی اشاعت کے

لئے سہل کی ہے۔ پیشِ نظر کتاب دعواتِ عبدیت حصہ اول ہے جس میں پانچ وعظ شامل ہیں۔ آداب المساجد دعا کے شرائط (اول و دوم) سیرت صوفی۔ استخفاف المعاصی۔ باقی ملفوظات ہیں جو ۲۷ مقالات حکمت۔ اور ۱۳ مجادلات معدلت پر مشتمل ہیں، دو دو ماہ کے وقفے سے یہ مواعظ شائع کئے جا رہے ہیں۔ تفصیلات ادارہ سے طلب کی جا سکتی ہیں۔ مواعظ کی افادیت اور ان کا موضوع ان کے عنوان سے ظاہر ہے۔ مضامین کی ترتیب اندازِ بیان اور لب ولہجہ اتنا اہم ہے کہ اس کو ہر حالت میں برقرار رہنا چاہیئے۔ حضرت تھانوی رحؒ کا اسلوب بیان پرانا ہو جانے کے باوجود اپنے اندر اس قدر نشاط انگیز اثر آفرینی رکھتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ ان مواعظ کی تاثیر کو مجروح کر سکتی ہے۔ یہ مسرت کی بات ہے کہ ادارہ اشرف المواعظ نے اس قسم کی ہر تبدیلی سے احتراز کیا ہے۔ تاہم ان کی معنوی افادیت کا دائرہ آج کسی قدر تنگ ہو گیا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مواعظ میں جہاں کہیں فارسی یا عربی کے ٹکڑے آ جائیں، بالخصوص اصطلاحات استعمال کی گئی ہوں ان کی توضیح حاشیہ میں ضرور ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر حسب ذیل عبارتیں قابل توجہ ہیں۔

صفحہ ۱۰: "العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص المورد" صفحہ ۱۱۔ "جواب یہ ہے کہ اگر سعی خاص ہوتی مباشر کے ساتھ تو شبہ کی گنجائش تھی"۔ صفحہ ۲۵۔ "قلب سے مراد یہ مضغۂ صنوبری نہیں"۔ صفحہ ۳۹۔ "کہ تخصیص ما شارٌ معنیٰ شار اور ذاتی اور لازم کے لئے علت کا سوال نامعقول ہے"۔ صفحہ ۱۰۰۔ "تألم مقولہ انفعال سے ہے" اس طرح کے متعدد مقام سامنے آتے ہیں جن سے عربی داں لوگ یا حضرت تھانوی رحؒ کے متوسلین قدیم تو مستفید ہو سکتے ہیں، مگر وہ لوگ جن کی استعداد یا جن کا مقام یہ نہیں وہ یقیناً یہاں الجھے بغیر نہ رہیں گے اور پھر اب جب کہ معمولی سطح کی اردو دانی بھی کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے جملوں کی حاشیہ میں وضاحت ضروری ہے۔

ہمارے نزدیک ادارہ اگر مواعظ کی اشاعت کے ساتھ ان مواعظ کے ایسے جملوں اور عبارتوں کی ایک مستقل فرہنگ شائع کر دے تو یہ ان مواعظ کی افادیت کو عام کرنے کے لئے پہلا مگر نہایت مفید قدم ہو گا۔ البتہ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اس فرہنگ کی تیاری کا کام کسی ایسی شخصیت سے لیا جائے جس کی حضرت تھانوی رحؒ کے مواعظ اور تصانیف پر بھی پوری نظر ہو اور جو سلیس انداز بیان میں اختصار کے ساتھ ان الفاظ کی وضاحت پر بھی قادر ہو۔

اس مشورے کے بعد ہم اس سلسلۂ وعظ کی اشاعت کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک قدیم و جدید ہر حلقۂ فکر کے لوگوں کے لئے ان مواعظ کا مطالعہ نہایت ضروری اور ناگزیر ہے۔ خصوصاً اس دور میں جبکہ ارشاد و اصلاح کے پاک و بے آمیز سلسلے عنقا ہیں۔ اور کایا پلٹ دینے والی شخصیتیں یا روپوش ہیں یا ناپید، فکر و نظر کی پاکیزگی اور علم و عمل کی اصلاح کے نقطۂ نظر سے جب بھی کوئی شخص ان مواعظ کو دیکھے گا تو بلا مبالغہ ان مواعظ میں اسے اکسیر ہاتھ آئے گی۔

اسبابِ زوالِ امت | مصنف امیر شکیب ارسلان۔ ناشر اردو ترجمہ۔ نور محمد یہ کارخانۂ تجارت کتب۔ کراچی

ضخامت ۱۴۸ صفحات۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

یہ ایک بہت مشہور مضمون کا اردو ترجمہ ہے جو مصر کے معروف دینی و علمی مجلّے المنار کے کالموں میں ۱۳۴۹ھ میں اب سے ۳۲ برس قبل شائع ہوا تھا۔ امیر شکیب کا قلم اور موضوع اتنا اہم، اس وقت سے پوری دنیائے اسلام میں اس مضمون کا چرچا ہے۔ بہت سے لوگوں نے امیر شکیب کے اس مضمون سے اخذ و اقتباس کیا ہے۔ ایک دردمند جاوی مسلمان شیخ محمد عمران نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ مسلمان مادی طور پر آج پوری دنیا میں کیوں پسماندہ ہیں حالانکہ وہ دینِ حق کے علمبردار ہیں اور دوسری قومیں دینِ باطل پر ہونے کے باوجود اس قدر آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس کے اسباب کیا ہیں۔ اور مسلمان دینی خوبیوں کو باقی رکھ کر مادی ترقی کس طرح کرسکتے ہیں۔ امیر شکیب نے اپنے مخصوص انداز میں امت مسلمہ کی پس ماندگی اور غیروں کی ترقی کا تجزیہ کیا ہے۔ پوری کتاب سوز و گداز اور درد و اخلاص سے لبریز ہے۔ قدیم و جدید ہر طبقے کے مسلمانوں کی کمزوریوں پر امیر نے بے باکانہ گرفت کی ہے۔ امیر شکیب ملت اسلامیہ کے گنے چنے افراد میں سے تھے۔ ان کی پوری کتاب کا خلاصہ ان فقروں میں سمٹ آیا ہے۔

> مسلم نے اپنی ترقی کی بنیاد قرآنی تہذیب پر قائم نہ کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان ملحد، نفس پرست اور گمراہ ہوجائیں گے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی ترقی کا نقصان اس کے فائدوں سے کہیں زیادہ ہوگا۔ کیونکہ جب تک علمی تربیت کے ساتھ ساتھ دینی تربیت کی رہنمائی نہ ہوگی مسلمان کبھی ایک نقطے پر جمع نہ ہوں گے۔

امیر نے کتنی جچی تلی بات کہی ہے۔ یہ کتاب آج سے تیس برس پہلے لکھی گئی تھی اس لئے اس میں کچھ وقتی مسائل بھی آگئے ہیں جو آج پرانے ہوچکے اور کہیں کہیں لب و لہجہ میں کچھ شدت بھی ہے۔ تاہم اپنے مقصد تالیف اور نقطۂ نظر کے لحاظ ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے۔ اردو ترجمہ سلیس و رواں ہے۔

ماہ نامہ انوارِ اسلام۔ بنارس | چندہ سالانہ چار روپئے۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ مشہور اہل قلم اور دردمند مسلمان ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری کی زیر نگرانی یہ ماہ نامہ چند ماہ سے شائع ہو رہا ہے۔ اب تک اس کے چند شمارے آچکے ہیں۔ دینی پرچوں میں یہ ایک گوشہ ہمیشہ سے خالی رہا ہے۔ جسے "انوار اسلام" نے پُر کیا ہے۔ برسوں کا یہ خلا پورا ابھی ہوسکے گا یا نہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ برادرانِ وطن کے سلسلے میں اعتراض و الزام اور مناظرہ و مباحثہ کی سطح سے ہٹ کر دعوت و تبلیغ اور افہام و تفہیم کے نقطۂ نظر سے اب تک کوئی منظم کوشش داعیانِ اسلام نے نہیں کی۔ واقعات کی رفتار سے آنکھیں بند کرکے وہ ایک ہی مخصوص لہجے میں مذہب کی بات کرنے کے عادی بن گئے۔ جس کا خمیازہ شاید انھیں ابھی برسوں بھگتنا پڑے گا۔ انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد حالات نے انھیں بتلایا کہ پچھلا سانچہ ٹوٹ چکا ہے۔ اب وہ تیور کام نہیں دیں گے۔ بلاشبہ اس وقت اہم ترین کاموں میں سے ایک کام یہ ہے کہ برادرانِ وطن کے دل و دماغ سے مذہب کے اس عناد آفریں تصور کو دور کیا جائے جو پچھلی ایک صدی میں فرنگی سیاست اور مسلمانوں کی غفلت کی بدولت پیدا ہوگیا۔ (باقی برصفحہ

(بقیہ نقد و نظر صفحہ) اور اسی کے ساتھ یہ جنت کام بھی اس درجہ ناگزیر ہے کہ قرآن کی اصل دعوت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی سیرت اور اسلام کے صحیح تصوّرات ان کی نفسیات کے تحت ان کے سامنے پیش کیے جائیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے پُرسکون اور اطمینان بخش مستقبل کے لیے اسلام کی صبر آزما جدوجہد نہایت ضروری ہے۔

"انوار اسلام" اس مہم کا علَم بردار بن کر سامنے آیا ہے۔ اس شمارہ میں مشرقی پنجاب کے ایک غیر مسلم کا مضمون "اسلام کی اخلاقی تعلیم" زمین و آسمان کی نقل و حرکت پر قرآنی نظریہ کی تائید، جادو ناتھ سرکار کی اسلامی معلومات پر مدیر کی تنقید، ایک غیر مسلم دوست کے اعتراضات اور ان کا جواب۔ قرآن کے عربی میں ہونے کی وجہ۔ حصۂ نظم، معارف و تبصرہ اور شعاعِ اولیں کے عنوان سے اداریہ ہے۔ اسی کے ساتھ اس پروگرام کو ہندی میں ملک گیر کرنے کی ایک اسکیم پیش کی گئی ہے۔ البتہ کتابت و طباعت قابلِ توجہ ہے

اداریہ میں جہاں مدیر کا اخلاص اور دردمندی بے اختیار نمایاں ہے، وہیں شخصیات کے ضمن میں لب و لہجہ اس معیار کے مطابق نہیں جو انوارِ اسلام جیسے دعوتی رسالے کا ہونا چاہیے۔ نقد و گرفت کے دامن پر ذاتیات کی چھینٹیں جب بھی پڑتی ہیں اس کا وزن خود بخود کم ہو جاتا ہے

جہاں تک رسالے کا تعلق ہے ہمارے نزدیک ہر دینی ادارے اور ہر لکھے پڑھے مسلمان کو اس کا خریدار ہونا چاہیے۔ اس کی اشاعت میں حسبِ توفیق ہاتھ بٹانا اس وقت ایک بڑی دینی اور ملّی خدمت انجام دینا ہے۔

الدرس العربی

فعلُ الامر

(۱) اِفْتَحْ	تو کھول	اِفْتَحِ البَابَ	تو دروازہ کھول
(۲) اِقْرَأْ	تو پڑھ	اِقْرَأِ الكِتَابَ	تو کتاب پڑھ
(۳) اُعْبُدْ	تو عبادت کر	اُعْبُدْ رَبَّكَ	تو اپنے رب کی عبادت کر
(۴) اُخْرُجْ	تو نکل	اُخْرُجْ مِنَ الحُجْرَةِ	کمرہ سے باہر نکل
(۵) اِجْلِسْ	تو بیٹھ	اِجْلِسْ فِي المَسْجِدِ	مسجد میں بیٹھ
(۶) اِرْفَعْ	تو بلند کر، اوپر اٹھا	اِرْفَعْ صَوْتَكَ	تو اپنی آواز بلند کر
(۷) اِسْمَعْ	تو سن	اِسْمَعْ نَصِيْحَةَ الأُسْتَاذِ	استاد کی نصیحت سن
(۸) اِهْدِ	تو راہ بتا، رہنمائی کر	اِهْدِنَا الصِّرَاطَ المُسْتَقِيْمَ	ہمیں سیدھا راستہ بتا

نمبر ایک سے نمبر ۸ تک جتنے افعال ہیں ان کے معنی پر غور کرنے سے چند باتیں سمجھ میں آتی ہیں: ایک یہ کہ ہر فعل میں ایک شخص کو مخاطب کرکے اُس سے کوئی کام طلب کیا جا رہا ہے، دوسرے یہ کہ جس شخص سے فعل کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ حاضر اور موجود ہے، تیسری بات یہ کہ نمبر ۱ سے نمبر ۷ تک ہر فعل کا مطالبہ بطور حکم ہے اور نمبر (۸) میں فعل کا مطالبہ ہے لیکن ایسا حکم نہیں جیسا کہ اوپر کی مثالوں میں ہے تو وہ فعل جس کے ذریعے کسی کام کے کرنے کا مخاطب کو حکم دیا جائے یا اُس سے کسی کام کا مطالبہ کیا جائے امر حاضر کہلاتا ہے۔ عربی گرامر کی اصطلاح میں ایسے فعل کو امر ہی کہا جائے گا لیکن دینی اصطلاح میں فعل کے دو نام ہیں: امر اور عرض یا دعا اگر حکماً کسی سے کوئی کام کرنے کیلئے کہا تو وہ امر ہے اور اگر چھوٹے نے بڑے کو مخاطب کرکے کسی کام کی طلب کی تو اس طلب کا نام عرض ہوگا یا دعا۔ جیسے آٹھویں مثال میں بندہ کی جانب سے بارگاہ خداوندی میں صیغۂ امر کے ذریعہ ہدایت کی درخواست کیجا رہی ہے۔

امر حاضر کے صرف چھ صیغے ہوتے ہیں:

واحد مذکر حاضر	تثنیہ مذکر حاضر	جمع مذکر حاضر	واحد مؤنث حاضر	تثنیہ مؤنث حاضر	جمع مؤنث حاضر
اُفْعُلْ	اُفْعُلَا	اُفْعُلُوْا	اُفْعُلِيْ	اُفْعُلَا	اُفْعُلْنَ
اِفْتَحْ تو کھول	اِفْتَحَا تم دونوں کھولو	اِفْتَحُوْا تم سب کھولو	اِسْمَعِيْ تو ایک عورت سن	اِسْمَعَا تم دو عورتیں سنو	اِسْمَعْنَ تم سب عورتیں سنو

الدرس العربي

من صحافة اليوم

تَكَالِيفُ القُنْبُلَةِ الذرّيَّةِ

٢٥٠٠٠ مَلْيُون دولار، أَنْفَقَتْهَا أمريكا عَلَى الأَبْحَاثِ الذرّيَّةِ ـ

* أَعْلَنَتْ لَجْنَةُ الطَّاقَةِ الذرّيةِ الأَمْرِيكِيَّةِ أَنَّهَا أَنْفَقَتْ حَتَّى الآن ... ٢٥ مليون دولار فِي برامجها الخَاصَّةِ بِالأَبْحَاثِ الذرّيَّة، وذٰلِكَ خِلَالَ المُدَّةِ من ١٩٤٠ حَتَّى الآن ـ بَلَغَتْ تَكَالِيفُ القُنْبُلَةِ الأُولَى وَحْدَهَا ٢٢٣٣ مليون دولار. وَقَدْ أَنْفَقَتِ اللَّجْنَةُ فِي العام المَاضِي وَحْدَهُ ٢٦١٢ مليون دولار.

القَضَاءُ عَلَى الِاسْتِعْمَارِ البرتغالي في جوا (گوا)

لَمَّا ازدادت الاعتداءات البرتغالية في گوا وَاشْتَدَّت فَنَفِذَ صَبْرُ الهند واضطرت الى اتخاذِ الاجراءات العَسْكَرِيَّةِ.

زَحَفَتِ القوّاتُ الهنديّة الى "گوا" بِكُلِّ سُرْعَةٍ وطُمَأْنِينَةٍ وَتَمَكَّنَتْ من الاستيلاء على مَنَاطِقِهَا بِدُونِ أَيَّةِ مُقَاوَمَةٍ شَدِيدَةٍ.

ایٹم بم کی لاگت (معارف)

امریکانے ایٹمی تحقیقات پر پچیس کروڑ ڈالر خرچ کئے ہیں۔

امریکی ایٹمی طاقت کے بورڈ نے اعلان کیا ہے کہ اسنے اب تک ایٹمی تحقیقات سے متعلق پروگراموں (منصوبوں) پر پچیس کروڑ ڈالر خرچ کئے ہیں۔ اور یہ (خرچ) ۱۹۴۰ء سے اب تک کے درمیانی عرصہ میں ہوا۔ تنہا پہلے ایٹم بم پر دو ارب تیئیس کروڑ تیس لاکھ ڈالر کی لاگت آئی ــــــ گزشتہ سال کمیٹی نے دو ارب اکسٹھ کروڑ بیس لاکھ ڈالر خرچ کئے۔

گوا میں پرتگالی سامراج کا خاتمہ

جب گوا میں پرتگالی جارحانہ کارروائیاں تیز تر ہوتی چلی گئیں تو ہندوستان کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور اسے فوجی کارروائی کرنی پڑی۔

ہندوستانی فوجوں نے پوری تیزی اور اطمینان کے ساتھ گوا کی طرف پیش قدمی کی اور اسکے علاقوں پر بغیر کسی بڑے مقابلہ کے قابض ہوگئیں۔

الالفاظ المفردة

تكاليف . لاگت	عشرة ملايين ایک کروڑ	لَجْنَةٌ کمیٹی . بورڈ	اتخاذُ الإجْراءِ . کارروائی کرنا
القُنْبُلَةُ . بم	مائة مليون . دس کروڑ	القَضَاءُ على (ض) خاتمہ کرنا	زَحَفَ (ف) پیش قدمی کرنا
ذَرَّة . ایٹم	الف مليون . ایک ارب	الاستعمار . سامراج	الاستيلاء . قبضہ کرنا
الذرّيّة . ایٹمی	دولار . ڈالر	اعتداءات . اِعتداء	مَنَاطِق . و: منطقة علاقہ
مَلْيُون . دس لاکھ	أبحاث . و: بحث تحقیق	جارحیت . حملہ . زیادتی	مُقَاوَمَة : مقابلہ

امتحانات کا ایک نیا سِلسلہ

خلافت راشدہ میں ہر مسلمان کی دینی واقفیت اور تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور امراء اور عمال حکومت کو گشتی فرمان جاری ہوئے تھے کہ کوئی مسلمان بنیادی دینی تعلیم سے محروم اور ان ضروری دینی معلومات سے بے بہرہ نہ رہے جو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہیں۔ یہ ایک طرح کی جبری دینی تعلیم تھی جس کا دائرہ نابالغوں تک محدود نہ تھا بلکہ بالغین بھی اس کے پابند تھے۔ اس شخص کی تادیب و تنبیہ کی جاتی تھی جو بقدر ضرورت بھی دینی تعلیم نہ رکھتا ہو۔ اس کو ایک خاص مدت کے لئے مہلت دی جاتی تھی کہ وہ اپنی اس کمی کو پورا کر لے پھر اس کا امتحان لیا جاتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں اس کی نمایاں مثالیں ملیں گی۔ یہ سب اس شعور و یقین پر مبنی تھا کہ

بنیادی اسلامی تعلیم کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کا وجود ممکن نہیں

اگر مسلمان بننا ہے اور مسلمان رہنا ہے تو اسلام کے عقیدے سے ضروری حد تک واقفیت اور اس کے ارکان و فرائض ادا کرنے کی قابلیت پیدا کرنا ضروری ہے۔

ملک میں اس وقت جس طرز تعلیم کا انتظام قائم کیا گیا ہے اس میں مسلمان طالبعلموں کا اپنے عقائد سے واقفیت اور اپنے دین سے وابستہ رہنا جس قدر مشکل ہو گیا ہے اس سے ہر واقف کار فکرمند ہے اور عام طور پر یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ آئندہ نسل کو اسلام سے وابستہ رکھنے کی کوشش ہم کو بطور خود کرنا چاہیئے۔

اس احساس کے تحت کارکنان اسلامی لائبریری اچھاور (بھوپال) نے دین کی ابتدائی واقفیت بہم پہنچانے کے لئے امتحان کا ایک طریقہ اختیار کیا ہے جو مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے ہے اور اردو ہندی دونوں زبانوں میں ہے۔

ہم ہر مقام کے مسلمانوں سے پر زور اپیل کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے اس ملک میں اپنی ملی خصوصیات اپنے پورے دینی عقائد اور اسلامی تہذیب کے ساتھ رہنے کا عزم کیا ہے تو امتحانات کے مراکز کا ایک جال سارے ملک میں پھیلا دینے کے لئے صدیقی رضؓ ذوق اور عثمانی رضؓ جذبہ کے ساتھ حصہ لیں۔

اس کے لئے ایک عظیم اور منظم مہم کی ضرورت ہے۔ تفصیلات کے لئے قواعد و نصاب مندرجہ پتہ سے طلب فرمائیں۔

عبدالرزاق سکریٹری اسلامی امتحانات۔ اچھاور (بھوپال)

وہ سعید روح زمین جس کا ہر ... ان جو ... ہیں منبر

المنبر — کی ہر سطر

دعوت الی اللہ اور اظہار حق کیلئے وقف ہے

آپ المنبر کا مطالعہ فرمائیے —

کا ہر شمارہ اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں بھرپور ہو

المنبر — نے • مکہ معظمہ • بغداد • است

• ٹوکیو اور دوسرے اہم مقامات سے حالات و کوا

حاصل کرنے کا خصوصی اہتمام کر رکھا ہے —

متعدد ممالک میں المنبر کے خصوصی نمائندے مقرر

المنبر

کے ذریعہ خدا کے دین کی منادی ہر شخص اور ہر گھر تک پہنچا

کچھ عرصہ کیلئے

زر تبادلہ نصف

کر دیا گیا ہے — آپ صرف چار

ادا کر کے سال بھر کیلئے المنبر طلب

فرما سکتے ہیں۔

المنبر

ن فتنوں کیخلاف

صرف جہاد ہے

دین میں ترمیم و تحریف

انکار سنت

قادیانیت

بہائیت

عیسائیت

اشتراکیت

غیر اسلامی نظام

ظلم و استبداد

انتشار و منافرت

گروہ بندی و عصبیت

فحاشی و عریانی

وطن دشمنی

اگر آپ

نظر کی گمراہی اور معاشرے

اسلام سے منحرف کرنیوالی

برائیوں کیخلاف

جدوجہد کرنا چاہتے ہیں تو

المنبر — آپ کا بہترین معاون ثابت ہوگا

زیر ادارت
عبدالرحیم اشرف

پوسٹ بکس ۱۰۱

مینجر المنبر لائل پور

ہندوستانی احباب اسا ... سالانہ دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ ...

Alqasim Monthly Deoband, (U. P.)

القاموس الجدید

اردو عربی ڈکشنری

Price Rs. 7/-

المطالعۃ المحمودۃ

Price Rs. 1/4/-

روحانی دنیا

Price Re. 1/-

مکتبہ دار الفکر دیوبند۔

Maktaba Darulfikr, Deoband. U. P.


ماهنامه
3 MAY 19
دیوبند
١٣٧٨ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

القاسم
دیوبند

شمارہ ۷
جلد ۲
مدیر مسئول
وحید الزماں کیرانوی
فاضل دیوبند

مرتب
سید عبدالرؤف عالی مظاہری القاسمی

سالانہ
پانچ روپیے
فی پرچہ
۴۰ نئے پیسے
....
معاون
ابوالحسن بارہ بنکوی
فاضل دیوبند

اپریل ۱۹۶۲ء — مطابق ذیقعدہ ۱۳۸۱ ہجری

ترتیب مضامین

نیا پروگرام

• ماہنامہ القاسم کا سال قاعدہ کی رو سے ستمبر سے شروع ہوتا ہے لیکن مجلس دارالفکر کی تجویز کے مطابق القاسم کی تیسری جلد اسلامی سال کے پہلے مہینے — محرم الحرام سے شروع کیجائے گی۔

• القاسم کے نئے پروگرام کے مطابق ماہ محرم سے شروع ہونے والے نئے سال میں ہر سہ ماہی پر چھوٹے کتابی سائز کے کم از کم اسّی صفحات پر مشتمل خاص نمبر پیش کئے جائیں گے — یہ خاص نمبر - تفسیر و حدیث، احکام شریعت، فلسفۂ احکام، سیرت، تاریخ اخلاق، معاشرت، معلومات جیسے اہم موضوعات پر - خریداران القاسم کیلئے سالانہ زر اشتراک ہی میں ہدیہ کئے جائیں گے۔

وحید الزماں قاسمی پرنٹر و پبلشر نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند میں چھپوا کر دفتر القاسم دیوبند سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک خرابی

اسراف و تبذیر

غور سے دیکھا جائے تو ہماری بیشتر مشکلات اور معاشرتی خرابیاں، معاملات میں عدم اعتدال اور اسراف و تبذیر کا نتیجہ ہیں۔ ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں جب حدِ اعتدال سے گزر کر اسراف و تبذیر میں قدم رکھتے ہیں تو ہمارے اعمال بُرائی اور معصیت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جابجا اعتدال کی تعلیم دی اور اسراف و تبذیر کو جرم و معصیت قرار دیا۔

اسراف تو یہ ہے کہ ایک چیز کو اس کے اصل مصرف میں خرچ کیا جائے مگر حد سے تجاوز ہو، اور تبذیر ایک چیز کو اس کے غلط مصرف اور بے جا استعمال کا نام ہے۔ اسراف بھی جرم ہے اور تبذیر بھی، مگر تبذیر اسراف سے سنگین تر ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں تبذیر کا ارتکاب کرنے والوں کو شیطانی برادری سے تعلق رکھنے والے قرار دیا گیا جو سخت ترین وعید ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ۔

بے موقع اور بلا ضرورت خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں

اور اسراف کرنے والوں کے بارے میں فرمایا گیا:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۝

خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

اسراف کسی نہ کسی حد تک نظر انداز کیا جا سکتا ہے، مگر تبذیر کسی طور بھی قابلِ عفو نہیں۔

خداوند کریم نے دولت و اقتدار تو اس لئے بخشا کہ ہم اسے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروری آسائش و راحت کا ذریعہ بنائیں۔ ضرورتمند رشتہ داروں اور حاجتمند لوگوں کی اعانت کریں۔ امت مسلمہ کے تعلیمی، اقتصادی اور دینی امور اور دیگر اعمالِ حسنہ میں صرف کریں۔ مگر ہماری دولت ان صحیح مصرفوں کے بجائے اسبابِ تعیش، لہو و لعب

نام ونمود اور دنیوی جاہ وعزت کے حصول پر صرف ہوتی ہے۔ اور وہ تمام مستحقین جو خدا کی بخشی ہوئی اس دولت میں حصہ دار بنائے گئے تھے، یکسر محروم رہ جاتے ہیں۔

قرآن حکیم میں حکم فرمایا گیا ہے:۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا

تم رشتہ داروں کا حق ادا کرو۔ نیز مسکین اور مسافر کو دو اور مال و دولت بے موقع نہ صرف کرو۔

موجودہ دور میں کتنے اصحاب ثروت ہیں جو اس حکم الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں کتنے افراد ہیں جن کی دولت فاقہ مست پڑوسیوں، بیوہ عورتوں، یتیم بچوں اور دوسرے مصیبت زدگان پر صرف ہو رہی ہے؟ ایک فاقہ مست اور پریشان حال انسان ہمارے پڑوس میں بھوک اور فاقہ کی شدت سے کراہ رہا ہے، بیوہ عورتیں، یتیم ولاوارث بچے معذور و اپاہج لوگ، ستر پوشی اور نان شبینہ کو ترس رہے ہیں، مگر ہماری نشست گاہیں لیڈران قوم، حکام وقت اور علماء و واعظین سے پر ہیں، دسترخوان انواع و اقسام کے ماکولات و مشروبات سے آراستہ و پیراستہ ہیں، جن کی لذتوں پر خوش حال مہمانوں کی سبحان اللہ اور واہ واہ کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ داعی اور مدعو سب ہی اس مسرفانہ اور مبذرانہ کارنامے پر مسرور و شاداں ہیں، بلاشبہ ان کے دل اخوت اسلامی، جذبہ تعاون، خشیت الٰہی اور کتاب و سنت کی تعلیم سے غافل ہیں۔

حقیقتاً آج ہماری سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ہماری دولت و ثروت اپنے صحیح مقام میں خرچ نہیں ہو رہی ہے۔ اگر کوئی نیک بندۂ خدا جذبۂ دینی اور اخوت اسلامی کے تحت اپنی دولت صرف بھی کرتا ہے تو وہ ایسے غیر محتاط ہاتھوں میں پہنچتی ہے جو خود اسراف و تبذیر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اسکے نتیجہ میں .... وہ رفاہی، تعلیمی اور دینی ادارے بھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکام ہوتے چلے جاتے ہیں جو فی الواقع اس دولت کا صحیح مصرف تھے۔

یقیناً :۔

آج کے دور میں جب کہ مسلمانان ہند خاص طور پر اقتصادی بدحالی میں مبتلا اور مختلف النوع مشکلات سے دوچار ہیں، ان کے مسائل حل کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ ہمارے اندر خلوص و ایثار اور جذبۂ صادق کارفرما ہو اور ہماری تمام تر جد و جہد صرف اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مسائل حل کرنے کے لئے ہو۔

اس وقت ہمارے سامنے تین اہم مسائل ہیں۔ اقتصادی مسائل کا حل، نتیجہ خیز تعلیمی نظام، موثر و کامیاب اشاعت دین اور یہی ہمارے شخصی اور اجتماعی سرمایہ کے تین مصرف ہیں۔ وقت کی ان اہم ترین ضرورتوں کی تکمیل صرف اس طرح ممکن ہے کہ ہمارے اندر اجتماعی طور پر کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو، اصحاب ثروت اپنی دولت کو اسراف و تبذیر سے بچا کر ملت مسلمہ کے اجتماعی اور تعمیری منصوبوں پر صرف کریں۔ یہ سرمایہ ایسے امین ہاتھوں میں منتقل ہو جو خود سرمایہ داروں کو اسراف و تبذیر میں مبتلا نہ ہوں اور اس سرمایہ کو اس کے صحیح مصرف میں خرچ کر سکیں۔

حقائق و بصائر

اِحتسابِ اعمال

(از مولانا ابو الکلام آزاد رح)

اخذ و تلخیص از ادارہ

ہم کو کاتبانِ اعمال کی خبر دی گئی ہے جو ہمارے یمین و یسار ہر وقت موجود رہتے ہیں تاکہ ہمارے تمام اعمال قلمبند کرتے رہیں اور جن کی موجودگی مسکین عرفی کو بہت شاق تھی۔

رقم کشانِ یمین و یسار دشمن تر
کہ می کنند سخن سنجی و قلم رانی

لیکن یہ ہماری کیسی نادانی ہے کہ ہم اپنے اعمال کی کتابت کراماً کاتبین کے ذمے چھوڑ دیتے ہیں۔ پر خود کبھی اپنے اعمال کا احتساب نہیں کرتے بہتر ہے کہ انسان خود ہی اس خدمت کو اپنے ذمّہ لے لے۔ اور قبل اس کے کہ "رقم کشانِ یمین و یسار" اس کا نامۂ اعمال اس کے سامنے لائیں، چند لمحوں کے لئے خود ہی اپنے اوپر ایک نظرِ احتساب ڈال لے اور اپنے ضمیر کو مخاطب کر کے کہے۔

اقرأ کتابک، کفیٰ بنفسک اليوم عليک حسيبا۔ (۱۷ : ۱۵)	اپنے اعمال کی اس کتاب کو پڑھ لے آج کے دن کسی دوسرے کاتب و شاہد کی ضرورت

نہیں خود تیرے ضمیر ہی کا احتساب تیرے لئے کافی ہے

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

اور فی الحقیقت ہمارے اعتقاد میں انسان کے لئے اصلی "کراماً کاتبین" اور "ترقیم اعمال" خود اس کا ضمیر اور نورِ ایمان ہی ہے۔ قرآن کریم نے جہاں کہیں احتسابِ اعمال کا ذکر کیا ہے، اگر غور سے دیکھئے تو وہاں اسی ضمیر کے فطری احتساب کی طرف اشارہ ہے۔ اعمالِ حسنہ کے وہ آثارِ سرور و انبساط جو چہروں پر سے "نضرۃ النعیم" کی خبر دیں گے درحقیقت و نیا میں بھی فرشتۂ ضمیر کی تبلیغِ بشارت سے موجود ہیں۔ وہ "نورِ ایمان" جس کو "یسعیٰ بین ایدیھم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ایک روشنی ہوگی جو اربابِ ایمان کے آگے آگے چلے گی اور ان کی عظمت و جبروت کو تمام صفوفِ اولین و آخرین میں نمایاں کرے گی۔ کیا مجبوری ہے کہ آپ اس کو قیامت ہی کے دن کے لئے اٹھا رکھیں اور دنیا کو بھی اس کا مصداق نہ قرار دیں؟

یوم لا یخزی اللہ	اور وہ دن جبکہ اللہ تعالےٰ

النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۶۶ : ۸)

اپنے پیغمبر اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رسوا نہیں کرے گا۔ ان کے ایمان کی روشنی ان کے آگے آگے، اور ان کے داہنی طرف ساتھ ساتھ چل رہی ہوگی، اور ان کی زبانوں پر یہ دعائیں ہوں گی کہ خدایا! اس روشنی کو ہمارے لئے آخر تک قائم رکھیو اور ختم نہ کر دیجیو، نیز ہمارے قصوروں کو معاف کر دیجیو، بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت، اور اس کے مثل صدہا آیات میں قرآن کریم نے ارباب ایمان کے جن نعائم اور ابتہاج و سرور کا ذکر کیا ہے یہ وہی حالات ہیں، جن کو دنیا میں ہر نیک ہستی اپنے اعمالِ حسنہ کا احتساب کر کے اپنے سامنے مشاہدہ کر سکتی ہے۔

جن لوگوں نے اپنے تئیں نفس کے تسلط سے نکال کر خدا کے ہاتھوں میں دے دیا ہے اور جن کے کاموں نے "ایمان و ایقان" کی روح اپنے اندر پیدا کر لی ہے، وہ جب اپنے اعمال کا احتساب کرتے ہیں تو یقیناً خوشیوں اور راحت کی ایک جنت میں ہوتے ہیں، جس پر سرورِ دائمی اور عیشِ سرمدی کی فضا چھائی ہوئی ہے، جس کے اندر شادمانی و کامرانی کی نہریں بہ رہی ہیں۔ جس کا کونہ کونہ سکونِ ابدی کے حسن و جمال سے "حورِ مقصورات" کا جلوہ گاہ ہے۔ جس کی ہر جانب سے "سلامٌ علیکم طبتم فادخلوها خالدین" کے نغماتِ خوش آہنگ بلند ہو رہے ہیں، جہاں نامرادی و حرمان کے فغان و ماتم کی جگہ ہر زبان پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ کا ترانۂ شکر جاری ہے۔ جہاں ناکامی و خجالت کی تپش و حرارت کا نام و نشان نہیں، کیونکہ کامیابی عیش و سرور کے اس تختِ طمانیت پر بٹھا دیئے گئے ہیں جہاں ٹیک لگا کر جس کو بٹھا دیا جاتا ہے پھر اُسے کسی مخلِ راحت حرکت سے سابقہ نہیں پڑتا

مُتَّكِئِیْنَ فِیْهَا عَلَی الْاَرَآئِكِ، لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا:

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّیُّوْنَ؟ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ، اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ، عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ، یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَّفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳ : ۱۸)

بیشک نیک لوگوں کے اعمال اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی فہرست میں ہیں اور تم جانتے ہو وہ کیا چیز ہے؟ وہ ایک کتاب اعمال ہے جو ہمیشہ لکھی جاتی ہے اور مقربانِ بارگاہِ الٰہی اس کے شاہد و گواہ ہیں یقیناً ان نیک اعمال لوگوں کی زندگی نہایت آرام اور راحت میں ہوگی وہ سکون اور طمانیت کے تخت پر بیٹھے ہوئے بہشت کی سیر کر رہے ہوں گے۔ تم اگر ان کو دیکھو تو خوشحالی کی تر و تازگی اُن چہروں سے نمایاں ہو۔ ان کو حیاتِ سرمدی کی وہ شراب پلائی جائے گی جس کی بوتلیں سر بمہر ہوں گی اور ان پر مشک کی مہریں لگی ہوں گی بس یہ زندگی ہے کہ تقلید کرنے والوں کو اس کی تقلید کرنی چاہیئے

لیکن جن لوگوں کی زندگی روحِ ایمانی سے خالی ہوتی ہے، جن کے اعمال سلطنتِ الٰہی کے ماتحت نہیں بلکہ قوتِ شیطانی کے تخت کے سائے میں انجام پاتے

ہیں، خواہ دینوی سازوسامان اور مادی اسباب
وجمعیت کتنی ہی فراہم کریں، لیکن بالآخر جب ضمیر کی آواز
ان کے کانوں میں آتی ہے، اور وہ اپنے نامۂ اعمال کو
اپنے سامنے رکھتے ہیں تو حرماں و نامرادی، رسوائی و نجالت
سے ان کے چہرے سیاہ پڑ جاتے ہیں۔ اور نورِ ایمان
کی جگہ ضلالت کی تاریکی کو اپنے ہر طرف محیط پاتے ہیں۔
وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ اور نافرمانوں کو تم دیکھو گے
مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌ کہ انہوں نے جیسے جیسے عمل
بِهِمْ، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا انجام دیئے ہیں اس کے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ وبال سے ڈر رہے ہوں گے
رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا (یعنی ان کا ضمیر ڈرا رہا ہو گا)
يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ حالانکہ اس کے نتائج ان کو
ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ضرور بھگتنے ہیں۔ اور (البتہ)
(۴۲ :) جو لوگ ایمان لائے اور اعمال
حسنہ انجام دیئے تو وہ ضرور بہشت کے سبزہ زاروں
میں ہوں گے۔ جو کچھ وہ چاہیں گے ان کے پروردگار
سے ان کو ملے گا۔ یہی بدلہ ہے جو نیک کام انجام دینے
والوں کے لئے سب سے بڑا فضلِ الٰہی ہے۔

پس درحقیقت احتسابِ اعمال اور ضمیر کی ملامت
یا اس کی تحسین، یہ جنت و دوزخ کی دو زندگیاں ہیں جو
اس دنیا میں ہر انسان کے لئے عاقبت کار میں موجود ہیں اور
ہر عاقل وجود اپنے اعمال گزشتہ کا احتساب کر کے۔ ان
دونوں حالتوں کو اپنے سامنے پا سکتا ہے، یہی انسان کے
لئے اصلی نامۂ اعمال اور یہی ہر وقت اس کے یمین و یسار
مصروف رہنے والا قلمِ احتساب ہے۔ اور یہی ہے جس
کے احتساب سے کوئی فرد بچ نہیں سکتا، کیونکہ یہ انسان
سے باہر نہیں، بلکہ انسان کے اندر موجود ہے۔ اور اس
کے نتائج کی ذرہ ذرہ کو ہمیشہ اس کی آنکھوں کے سامنے
کر دینے والا ہے۔
وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ اور ہم نے ہر انسان
فِيْ عُنُقِهٖ، وَنُخْرِجُ لَهٗ کے عمل کی برائی اور بھلائی
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ کے نتائج کو خود اس
مَنْشُوْرًا۔ (۱۷ : ۱۵) کے وجود کے اندر اس
طرح رکھ دیا ہے گویا اس کے گلے کا ہار ہے اور قیامت
کے دن ہم اس کے اس نامۂ اعمال کو نکال کر اس کے سامنے
کر دیں گے اور وہ اس کو اپنے سامنے کھلا ہوا دیکھے گا۔

خاکساری

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدائن کے گورنر تھے۔ لیکن طرزِ معاشرت
اس قدر سادہ رکھا تھا کہ کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ ایک شخص نے گھاس
خریدی اور آپ کو بیگار میں پکڑ کر گٹھڑی سر پر لاد دی۔ وہ چلے تو لوگوں نے
بتایا کہ یہ امیر ہیں۔ صاحب رسول اللہ ؐ ہیں"۔ اس نے معذرت طلب کی اور عرض کیا کہ
میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ بوجھ سر سے رکھ دیجئے۔ حضرت سلمان فارسی رض نے
فرمایا۔ نہیں اب تو تمہارے گھر پہنچا کر اتاروں گا۔

مرتبہ: ذہانتِ نبویؐ

کلمۂ طیبہ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے ساتھ درمیانی حصے میں حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی تھے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان سے اٹھ کھڑے ہوئے (اور باہر تشریف لے گئے) اور آپ نے ہماری طرف لوٹنے میں بہت دیر کی، اور ہمیں اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں آپ ہم سے جدا نہ ہو جائیں اور ہم گھبرا اٹھے اور کھڑے ہو گئے۔ تو میں پہلا شخص تھا جو گھبرایا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرنے کے لئے نکلا اور انصار بنی نجار کے باغ تک آیا تو میں اس کے چاروں طرف پھرا مگر میں نے اس کا کوئی دروازہ نہیں پایا۔ تو اچانک (میں نے دیکھا کہ) باہر کے کنوئیں سے ایک نالی باغ کے اندر جا رہی ہے، اور نالی (سے مراد) کول ہے۔ تب میں سمٹ سمٹا کر اس میں گھس کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گیا۔ (مجھے دیکھ کر) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابوہریرہ! (تم؟) میں نے کہا ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا۔ تمہارا کیا حال ہے۔ میں نے عرض کیا آپ ہمارے درمیان بیٹھے تھے کہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ (اور باہر تشریف لے آئے) جب آپ نے ہماری طرف واپسی میں تاخیر فرمائی تو ہم ڈرے کہ ہمارے بغیر (تنہائی میں) آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ تو ہم گھبرائے (میں پہلا شخص تھا جو گھبرا کر اس باغ تک پہنچا۔ اور اس طرح سمٹا (اور سمٹ کر اندر آیا) جس طرح لومڑی (بل میں جانے کے لئے) اپنے (بدن) کو سمیٹ لیتی ہے۔ اور یہ لوگ (یعنی دوسرے صحابہ) میرے پیچھے (آ رہے) ہیں (یہ سن کر) آپؐ نے مجھے اپنے جوتے عطا فرمائے اور فرمایا۔ اے ابوہریرہ یہ میرے جوتے لے جاؤ اور جو شخص اس باغ کے سامنے تمہیں لا الہ اللہ کا اقراری اور دل سے اس پر یقین رکھنے والا ملے اس کو جنت کی خوش خبری سنا دو۔ تو سب سے پہلے جس سے میں ملا وہ عمرؓ تھے۔ (مجھے دیکھ کر) کہنے لگے۔ اے ابوہریرہ یہ دونوں جوتے کیسے ہیں میں نے کہا۔ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جوتے ہیں۔ آپ نے مجھے یہ دے کر بھیجا ہے (تاکہ) جو شخص مجھے لا الہ الا اللہ کا معترف اور اس پر دل سے ایمان رکھنے والا ملے اسے جنت کی بشارت دوں۔ (یہ سنتے ہی) حضرت عمرؓ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا تو میں کولھوں کے بل گر پڑا۔ وہ کہنے لگے کہ ابوہریرہ لوٹ جا چنانچہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لوٹ آیا۔ میں زور سے رونے لگا اور عمر جو میرے سر پہ سوار چلے آ رہے تھے۔ میرے پیچھے اک دم سے آ پہنچے

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ ابوہریرہ کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں (راہ میں) عمر سے ملا تو انہیں اس بات کی خبر دی جسے پہنچانے کے لئے آپ نے مجھے بھیجا تھا۔ تو انہوں نے میرے سینے پر ایک دوہتڑ مارا میں پیچھے کی طرف گر پڑا۔ پھر کہنے لگے جا لوٹ جا۔ (یہ سن کر) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے عمر تجھے اس بات پر کس نے آمادہ کیا۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، کیا ابوہریرہ کو آپ نے اپنے جوتے دے کر اس لئے بھیجا تھا کہ جو شخص انہیں لا الہ الا اللہ کا اقرار اور دل سے اس کا یقین کرنے والا ملے اُسے وہ جنت کی خوش خبری دے دیں۔ آپ نے فرمایا ہاں (اس پر) حضرت عمر رضہ نے کہا ایسا نہ کیجئے کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔ آپ انہیں چھوڑ دیجئے تاکہ عمل کریں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا انہیں (عمل کے لئے) چھوڑ دو (مسلم)۔

تشریح: انسان فطرتاً بہت کمزور واقع ہوا ہے، کسی چیز کا خوف غالب ہو تو دہشت سے جان دے بیٹھتا ہے، امیدوں کی دنیا آباد کرے تو محنت اور کوشش کا نام نہ لے۔ اور صرف امیدوں کے بل پر جینا چاہے۔ اسلامی احکام و تعلیمات میں انسانی فطرت کے یہ دونوں پہلو ملحوظ رکھے گئے۔ اسی لئے جو لوگ اسلام کا ادھورا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی پوری تعلیم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ کبھی کبھی اسلامی ہدایات اور قوانین میں تضاد محسوس کرتے ہیں حالانکہ یہ تضاد خود اسلامی معلومات سے پوری طرح واقف نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ مذکورہ حدیث میں اسلامی تعلیمات کا یہ پہلو اتنا نمایاں ہے کہ اس کے بعد مزید کسی تشریح کی حاجت نہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہ کو بشارتِ عام دینے کا جو حکم فرمایا تھا وہ عذاب الٰہی اور قہر الٰہی سے گریزاں اور ترساں بندوں کی تسلی اور دلدہی اور اللہ کی رحمت عام کی فیض بخشیوں کا تقاضا تھا۔ جسے سرورِ کائنات رحمۃ للعٰلمین اپنے جذبۂ شفقت و محبت کے تحت ہر مومن تک پہنچا دینا چاہتے تھے۔ لیکن دوسری طرف حضرت عمرؓ جو انسانی اصلاح کے لئے رعایت اور نرمی کو مضر خیال کرتے تھے، جب ابوہریرہ سے ملے تو انہوں نے اپنے دینی فہم اور حکیمانہ بصیرت سے یہ سمجھ لیا کہ اس وقت ابوہریرہ رضہ کی زبان سے یہ اعلانِ بشارت محض رسول اللہ صلعم کے جذبۂ رافت و رحمت کا نتیجہ ہے حکم ربانی نہیں ہے کہ جس کی منادی کرنا ضروری ہو۔ ادھر ابوہریرہؓ کے بارے میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ جو والہانہ تعلق رکھتے ہیں اور خود جس وارفتہ طبیعت کے مالک ہیں اس نے انہیں رسول اللہ صلعم کے ارشاد کے بارے میں کچھ غور کرنے کی مہلت نہ دی ہو گی اس لئے انہوں نے ابوہریرہ کو واپس جانے کی ہدایت کی اور خود رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے اصل حقیقت دریافت کی۔ اس کے بعد اپنی رائے ادب کے ساتھ پیش کر دی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کی رائے سے اتفاق فرمایا، اور عملی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ اس طرح ایک طرف رحمت خداوندی کی وسعت و ہمہ گیری اور رسول اللہ صلعم کی انسانی

شفقت و ہمدردی کا یہ عالم کہ ہر صاحب یقین مومن کو لیے جنت کی بشارت عام۔ اور دوسری طرف نفس انسانی کی کوتاہ عملی، سہولت پسندی اور آرام طلبی کے جراثیم سے حرکت و عمل کی قوتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اس بشارت کی شہرت عام سے گریز ایسا حکیمانہ اور نفسیاتی طرز عمل ہے جس کی توقع ایک پیغمبر کے سوا کسی اور سے کی ہی نہیں جا سکتی۔ پھر اس ذیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صائب رائے یہ بتلاتی ہے کہ رسولؐ کی صحبت میں زندگی بسر کرنے والے اشخاص بلند صلاحیتوں اور اونچی شخصیتوں کے مالک ہوں تو ان میں بھی پیغمبرانہ حکمت و بصیرت وہ نگاہ پیدا کر دیتی ہے جس سے نہ صرف فرد کی بلکہ معاشرہ کی اور یوں کہئے کہ پوری انسانی آبادی کی اخلاقی و عملی تربیت کی جا سکتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کو آپ نے اپنے جوتے یا تو اس وجہ سے عطا فرمائے کہ تلاش کرنے والے صحابہ یہ سمجھ لیں کہ آپ صحیح سلامت ہیں، یا اس لئے عنایت فرمائے کہ جنت کی بشارت عام سن کر لوگ ابوہریرہ رضؓ کی تصدیق کر سکیں کہ رسول اللہؐ ہی کے پاس سے آرہے ہیں۔ بہت ممکن ہے صحابہ کی مجلس میں جب رسول اللہؐ تشریف فرما ہوں تو کچھ عذاب الٰہی کا اور اللہ کی صفت غضب کا ذکر ہو رہا ہو، اور اس سے لوگوں پر ایک مایوسی اور ہیبت طاری ہوگئی ہو۔ اس کے بعد جب آپ مجلس سے اٹھ کر باہر ایک باغ میں تشریف لے گئے تو وہاں الہامی طور پر یہ بشارت آپ کو معلوم ہوئی چنانچہ لوگوں کی تسکین اور دلجوئی کی خاطر آپ نے مناسب سمجھا کہ اس وقت لوگوں کو یہ خوشخبری سنا دی جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ کی رائے سن لینے کے بعد پھر اپنی رائے سے رجوع فرما لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بشارت تو اپنی جگہ واقعی صحیح تھی اور اللہ ہی کی طرف سے تھی مگر اس کی منادی اور اعلان کا اللہ نے حکم نہیں فرمایا تھا، یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے عالی تھی۔ اس لئے حضرت عمرؓ کو بھی یہ جرأت ہوئی کہ اپنی رائے پیش کر دیں اور رسول اللہؐ نے بھی اعلان و اطلاع کو روک دیا، اگر اس کا اعلان بھی اللہ کی طرف سے ضروری ہوتا تو حضرت عمر اس میں کوئی دخل دے سکتے تھے اور نہ حضورؐ اس کو ترک فرما سکتے تھے

بقیہ صفحہ عورتوں کی اصلاح

لہذا دکانداروں کی پرواہ کے بغیر امر بالمعروف کی کوشش کرنا استطاعت کا ایک ہلکا سا عکس ہے جس میں عوام و خواص دونوں کے لئے بے شمار فوائد پوشیدہ ہیں۔

یہ چند تجاویز پاس کی گئیں۔ انشاء اللہ ان تجاویز کا ہر جانب سے شاندار استقبال کیا جائے گا ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں فلاح و بہبود اور رفاہ عام کے کاموں کے کرنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

فلسفۂ عقائد

حقیقت معجزہ

قسط نمبر ۴

از حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ

معجزہ اور دعویٰ نبوت

معجزہ میں دعویٰ کی شرط بھی کی گئی ہے۔ یعنی نبی نبوت کا دعویٰ بھی کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب فرقے مانتے ہیں کہ خدا سب سے زیادہ سچا ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلاً اور جھوٹ کے نقص سے اس کی ذات پاک ہے تو میں کہتا ہوں کہ جھوٹ کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص خود خلاف واقعہ بات کہے اور کبھی اس طرح کہ جھوٹی بات جو دوسرے نے کہی ہے اس کی تصدیق کر دے۔ پھر تصدیق بھی دو طرح سے ہوتی ہے کبھی زبان سے کبھی عمل سے، اور یہ عملی تصدیق بسا اوقات قولی تصدیق سے بڑھ کر مؤثر ہوتی ہے۔ جیسے ایک شخص بادشاہ کی مجلس میں یہ کہتا ہے کہ بادشاہ کو میرے ساتھ خاص الفت یا رعایت ہے، میں اس کا معتمد خاص ہوں، جو میں کہوں گا بادشاہ ضرور تسلیم کرے گا۔ اور یہ اس کے دعاوی بادشاہ مجلس میں خود سن رہا ہو۔ اس کے بعد وہ شخص اپنے دعوٰی کو ثابت کرنے کے لئے بادشاہ سے کہتا ہے کہ فلاں شخص کو خط لکھ دیجئے، فلاں حاکم کو معزول کر دیجئے، فلاں امیدوار کو عہدہ دے دیجئے، پھر کہتا ہے کہ آپ ذرا کھڑے ہو جایئے، پھر کہتا ہے کہ آپ بیٹھ جایئے۔ اور بادشاہ بھی ازراہِ مہربانی اپنے عام ضابطہ اور عادت کے خلاف اس کے کہنے کے موافق کرتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ بادشاہ نے اس کے قول کی عملی تصدیق کر دی جو کہ قولی تصدیق سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے۔ اگر بادشاہ قول سے تصدیق کرتا تو شاید اتنا مؤثر نہ ہوتا۔ اتنی بات اس مثال میں ضرور ہے کہ بادشاہ ایک انسان ہے، وہ جھوٹی تصدیق بھی کر سکتا ہے۔ مگر اللہ جل شانہٗ کے یہاں جھوٹ اور کذب کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

پس جو نبی دعویٰ کرتا ہے کہ میں نبی ہوں۔ اگر میری بات سنو گے تو نجات ہے ورنہ عذاب مخلّد میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ نجات کا راستہ منحصر ہے میری متابعت میں۔ اور یہ دعویٰ اللہ کے سامنے کرتا ہے، اللہ کی زمین پر اور اس کے آسمان کے نیچے بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میری متابعت کے بغیر کوئی راستہ نجات کا نہیں ہے، اور اس کی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ میرے

ہاتھوں اور زبان سے وہ چیزیں ظاہر فرمائے گا جو اس کی عام عادت کے خلاف ہوں گی اور دنیا ان کی مثال لانے سے عاجز ہو گی۔ پھر اس کے موافق مشاہدہ بھی کیا جا رہا ہو تو یہ خدا کی جانب سے عملاً اس کے دعوے کی تصدیق ہے۔ درحقیقت معجزہ نبی کے دعوے کی عملی تصدیق ہوتی ہے۔ اور اللہ چونکہ جھوٹی تصدیق نہیں کر سکتا لہٰذا نبی کا دعوے معجزہ کے ظہور کے بعد سچا ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہم بلا خوف بہ یقین رکھتے ہیں کہ خداوند خود جو کہ تمام سچائیوں کا سرچشمہ ہے کسی انسان کو یہ دسترس نہ دے گا کہ وہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرکے ایسے خوارق عادات دکھلائے کہ دنیا اس کے مقابلہ سے عاجز ٹھہرے۔ جس کا جی چاہے اب بھی اس ضابطہ کا امتحان کر دیکھے۔ ضرور ہے کہ خدا ایسے حالات بروئے کار لائے گا کہ اس کی طرف سے جھوٹے کی عملی تصدیق نہ ہونے پائے۔

عملی تصدیق کی مثال

آپ جلسوں میں دیکھتے ہیں اور کونسلوں اور پارلیمنٹ کا حال سنتے ہیں کہ جب کسی مسئلہ پر کسی تجویز پر، کسی انتخاب پر بحث ہو جاتی ہے تو ایک طرف سے محرک اپنی تحریک پاس کرانے کے لئے حضار کے سامنے بسط سے دلائل بیان کرتا ہے اور دوسری طرف تردید کرنے والا اس کے تردیدی دلائل مفصلاً سامنے رکھتا ہے، اس ردوکد کے بعد فیصلہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ رائے لی جائے جس کی صورت یہ ہے کہ ہاتھ اٹھوائے جاتے ہیں اور یہی ہاتھ اٹھا دینا یا نہ اٹھانا اس ریزولیشن کی تصدیق و تائید، یا تکذیب و تردید کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے، زبان ہلانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک شخص کی نسبت پبلک جلسہ میں رائے لی جاتی ہے کہ آیا اس پر ممبر کو اعتماد ہے؟ اس پر ہاتھ اٹھا دیئے جاتے ہیں، یہی علامت ہوتی ہے اس بات کی کہ ان سب کی رائے اس شخص کے حق میں ہے۔ ہم رات دن سینکڑوں دفعہ اپنے ہاتھ اوپر کو اٹھائیں اس کو کسی چیز کے ثابت کرنے یا نہ کرنے میں کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن یہی ہمارا ہاتھوں کی وضع طبعی اور ہیئت اصلی کے خلاف اوپر کو اٹھا دینا جب کسی ریزولیشن کی تسلیم و انکار یا کسی دعوے کی صحت و بطلان کی آزمائش کے موقع پر ہو تو کسی غبی سے غبی انسان کو بھی شک شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، اس وقت ان کھڑے ہوئے ہاتھوں ہی کے شمار کو رایوں کا شمار کر لیا جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے نازک اور عظیم الشان مسائل کے فیصلے ہاتھ کی اس غیر طبعی حرکت پر بے چون و چرا ہو جاتے ہیں۔ بس جس طرح ہاتھوں کا نیچے لٹکے رہنا آدمی کی عام عادت اور وضع طبعی کے موافق ہے اور اوپر کو اٹھانا کبھی کبھی خاص ضرورت اور مصلحت سے ہوتا ہے اور یہی غیر طبعی وضع جب کسی ریزولیشن پر ووٹ لینے کے وقت اختیار کی جائے تو اس ریزولیشن یا دعوے کی بے شک و شبہ تصدیق و تائید سمجھی جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کا جو فعل سنن طبعیہ کے سلسلے میں ظہور پذیر ہو وہ اس کی عام سنت اور عادت کہلاتا ہے اور جو اسباب سے علیحدہ ہو کر کسی خاص مصلحت اور حکمت کے اقتضاء سے ظاہر ہو وہ خرق عادت ہے اور یہی خرق عادت جب کسی شخص کے دعوئ نبوت اور تحدی کے بعد اس سے یا اس کے کہنے کے موافق صادر ہو یہ معجزہ ہے جو کہ من اللہ اس کے دعوے کی فعلی تصدیق ہے۔ اور میں کہہ چکا ہوں کہ حق تعالیٰ کسی جھوٹے کی قولاً یا فعلاً تصدیق نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہم کو ایسے مدعی کے دعوے میں شک کرنے کا کوئی حق نہیں۔

الجزائر

۱۳۰ برس کی خونیں جدوجہد کی داستان

یکم نومبر ۱۹۵۴ء کی رات کو سارے الجزائر میں اچانک آزادی کی جنگ چھڑ گئی۔ یہ ایک مسلح تحریک تھی جس نے پانچ لاکھ فرانسیسی نوجیوں سے اپنی ٹکر میں دھیرے دھیرے مگر شاندار کامیابیاں حاصل کریں۔ ایسی کامیابیاں جن کی وجہ سے فرانس نے مجبور ہو کر مجاہدینِ آزادی کی عارضی حکومت الجزائر کو بطور حقیقت تسلیم کر لیا ہے۔ ساری دنیا میں اس عظیم اور بے مثل جدوجہد کو خراجِ تحسین ادا کیا جا رہا ہے۔

جنوری ۱۹۶۲ء میں جب کل ہند کانگریس کا ۶۷واں اجلاس پٹنے میں ہو رہا تھا تو عارضی حکومت کے نمائندے شریف جلال نے صدر کانگریس شری سنجیوا ریڈی کے نام اپنے پیام میں مندرجہ ذیل حقائق پیش کیے تھے۔

الجزائر کی ایک کروڑ آبادی میں سے دس لاکھ افراد سامراج کی خونریزیوں کا نشانہ بن چکے ہیں، خاص الجزائر میں تین لاکھ افراد کو جدوجہد آزادی کے تعلق کے جرم میں قید کر دیا گیا ہے۔ چار لاکھ سے زیادہ باشندے وطن سے بھاگ کر ہمسایہ مملکتوں تیونس اور مراکش میں پناہ گزیں ہیں۔ الجزائر میں بیس لاکھ افراد کو آبادیوں، بستیوں اور قصبوں سے بزورِ شمشیر نکال کر نئے مقامات پر بسا دیا گیا ہے۔ ان بیس لاکھ انسانوں کو ان کی جائداد اور گھر بار سے الگ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ جدوجہد آزادی کے علاقوں کو کوئی امداد نہ دے سکیں۔

امیر عبدالقادر

لیکن اس "جرم" کی کہانی بہت لمبی ہے، آزادی کی بے نیام تلواروں کو الجزائر کے عوام نے پشتہا پشت سے مدد دی ہے۔

سوا سو سال پہلے مارچ ۱۸۳۰ء میں فرانسیسی سامراج کے لشکروں نے الجزائر میں اتر کر قبضہ و تسلط کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس وقت عربوں کا المغرب ایک وحدت تھا۔ مراکش کے سلطان مولائے عبدالرحمان نہ صرف مراکش بلکہ الجزائر اور اندرون تیونس کے حاکم تھے۔ درباری سازشوں کی وجہ سے مراکش کے سپہ سالار ابو الحسن علی المراکشی، الجزائر کو فرانسیسیوں سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے اور مولائے عبدالرحمان نے مجبور ہو کر فرانس سے صلح کر لی، الجزائر کے سواحل پر فرانس کا قبضہ ہو گیا اور اندرونِ ملک کے قبائل کو مسخر کرنے کی تیاریاں کی جانے لگیں۔

گو المغرب پاش پاش ہو چکا تھا مگر اہل المغرب زندہ و بیدار تھے۔ الجزائر میں ساداتِ حسنی کا ایک خاندان آباد تھا جس کے علم و فضل اور تدبر و تفقہ کی

شہرت تھی، خصوصاً سید محی الدین کو قبائل عرب اور
بربر میں زہد و علم کی بنا پر قبول عام حاصل تھا۔ وہ
الشیخ کے لقب سے مشہور تھے۔ صوفی اور عالم باپ کے
نوجوان بیٹے نے ۱۸۳۲ء میں نعرۂ جہاد بلند کیا۔

یہ امیر عبدالقادر الجزائری تھے جن کا سن صرف
چوبیس سال کا تھا۔ علمائے اسلام شیوخ قبائل ان
کے گرد جمع ہو گئے۔ اور معسکر میں ان کی بیعت کر کے
تنظیم جہاد کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ آزادی کی اس
پرجوش جنگ نے سامراج کو اکھاڑ پھینکا۔ امیر عبدالقادر
کی شجاعت کے افسانے یورپ میں الف لیلیٰ کی کہانیوں
طرح پھیل گئے، سامراجی لشکروں نے شکست پر
شکست کھائی۔ امیر عبدالقادر کے

برادر شہسوار گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر سوار ہو کر
تلواریں اور نیزے لیے فرانس کے فوجی استحکامات اور
قلعہ بندیوں پر ٹوٹ پڑے، ان مجاہدوں نے بندوقیں
اور توپخانہ خود فرانسیسیوں سے چھین کر حاصل کیا۔
یورپ میں امیر کے سپاہیوں کا تذکرہ یوں ہوتا تھا
جیسے الف لیلیٰ کے جن بوتلوں سے نکل آئے ہیں۔

فرانس دو ہی سال میں امیر کا اقتدار تسلیم کر کے
صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح ۱۸۳۴ء میں دونوں
فریقوں کے درمیان ایک معاہدہ کا قیام عمل میں آیا۔
لیکن فرانس نے موقع پا کر اس معاہدہ کو توڑ پھینکا۔
مجاہدین اسلام کے دست و بازو پھر حرکت میں آ گئے
اور ۱۸۳۷ء میں فرانس ایک بار پھر مجبور ہوا کہ امیر سے
معاہدۂ صلح کرے، مگر فرانس کی فطرت دغابازی کے بے
حساب عناصر سے بنی ہے۔ اس نے پھر معاہدہ کے
تقدس کو پامال کیا۔ جہاں توپوں کے گولے کارگر نہ ہو
سکے وہاں جوڑ توڑ کا خفیہ بازار گرم کیا۔ سیم و زر کی
بارشیں ماریں اور بالآخر ۱۸۴۷ء میں یہ صورت حال
بن گئی کہ موت سے کھیلنے والے امیر عبدالقادر کو مایوس
ہو کر ہتھیار ڈال دینا پڑے۔ فرانسیسی سپہ سالار نے وعدہ
کیا تھا کہ ان کو بصد احترام آزاد زندگی بسر کرنے کی
اجازت ہوگی، مگر فرانس نے اس موقع پر بھی اپنی مکار
فطرت کا ثبوت دیا اور امیر کو مع اہل و عیال قید کر کے
فرانس لے جایا گیا۔ اسیران بلا کا یہ قافلہ طولون کی بندرگاہ
پر پہنچا تو شہر ان کو دیکھنے کے لئے امنڈ آیا

امیر عبدالقادر شکست خوردہ تھے، اسیر تھے، مگر عوام نے
ان کی جرأت کے افسانے سنے تھے جس راستے سے
ان کی گاڑی گزرتی تھی، فرانسیسی عوام نعروں سے استقبال
کرتے تھے۔ پیرس پہنچے تو فیشن ایبل سوسائٹی میں یہ
بات بڑے فخر کی شمار ہوتی تھی کہ فلاں خاتون نے
امیر عبدالقادر کو دیکھا ہے۔ اور فلاں صاحب نے
ان سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل کیا ہے۔ یہ
حالت دیکھ کر حکومت فرانس نے ان کو اس شرط
پر رہائی کی پیش کش کی کہ وہ الجزائر اور فرانس میں
کبھی تشریف نہ لائیں، امیر عبدالقادر کی عظمت کا
یہ احترام تھا کہ ان کا زبانی وعدہ کافی سمجھا گیا۔

امیر عبدالقادر مجبور تھے، پہلے فلسطین پھر دمشق
میں سکونت اختیار کی، یہاں مطالعے اور تدریس و
تالیف کا مشغلہ اختیار کیا۔ عمر طویل پا کر ۱۸۸۳ء میں
سفر آخرت اختیار کیا۔ موت سے تین سال قبل فلسطین
میں دروزیوں نے نصرانیوں کی غداری سے مشتعل
ہو کر اہل فرنگ کا قتل عام کیا تھا۔ اس حادثے میں ہزارہا
نصرانیوں۔ فرنگیوں اور یہودیوں کو امیر عبدالقادر

نے پناہ دی جس نے ان کے مکان اور خانہ باغ میں پناہ لی اس کی جان لینے کی ہمت کس میں تھی؟ امیر عبدالقادر جلاوطن تھے، مگر دلوں کے بادشاہ تھے۔

امیر عبدالقادر کے ایک ہم سبق بزرگ ابو معزی المراکشی تھے۔ ۱۸۳۵ء میں الجزائر کے جہاد کا غلغلہ سُنا تو مراکش کے شہر دازان میں اپنے جدامجد السید الطیب کی خانقاہ چھوڑ کر الجزائر پہنچے اور بہت سے بہادر قبیلوں کی تائید و حمایت سے امیر عبدالقادر سے الگ ایک نیا محاذ جنگ فرانس کے خلاف کھولا فرانس نے ان کو امیر عبدالقادر سے لڑانے کی سازشیں کیں مگر اسلام کا یہ مخلص جانباز اس فریب میں آنے کے بجائے باقاعدہ امیر عبدالقادر سے جاملا اور اب یہ دونوں محاذ ایک ہوگئے۔ ابو معزی کی حوصلہ مندی کا یہ عالم تھا کہ جب امیر عبدالقادر نے ہتھیار ڈالے تو اس کا حوصلہ اس وقت بھی ہار ماننے کے لئے تیار نہیں ہوا، اور اس دم تک جنگ جاری رکھی جب تک فرانس کے ہاتھوں قید نہیں ہوگئے۔ ابو معزی کے ساتھیوں نے ان کے بعد بھی جنگ جاری رکھی۔ اگرچہ کامیابی کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ یہ الجزائر کے جہادِ آزادی کا پہلا دور ہے۔

آزادی کی طلب اور اس کے حصول کے لئے جان و مال کی فداکاریوں کے جذبے دبے نہیں تھے وہ آگ جو امیر عبدالقادر نے روشن کی تھی بجھ نہ سکی وہ برابر روشن رہی۔ ہر دس سال کے بعد ایک نہ ایک مجاہد الجزائر کے صحراؤں اور پہاڑوں میں نمودار ہوتا رہا۔ اور عوام نے پورے جوش و خروش سے ہر صدا پر لبیک کہا۔

دوسرا دور

دوسرے دور میں دس زبردست تحریکیں اٹھیں۔ ان کی قدر مشترک یہ ہے کہ سبھوں نے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ عربوں اور بربریوں نے ساٹھ سال تک برابر فرانس سے ٹکر لی۔ اس کے نتیجے میں ان کو الجزائر کے ساحلی علاقوں سے نکلنا پڑا۔ جو زرخیز و شاداب تھے، جہاں سامراجی لشکر آسانی سے پہنچ جاتا تھا۔ عوام نے ان علاقوں سے ہجرت کی اور اندرون ملک میں جانے لگے سامراج نے ساحلی زرخیزیوں پر آبادکاروں کو منظم طریقہ سے بسایا، الجزائر کا بہترین حصہ یہی تھا۔ زرعی پیداوار اور پھلوں کی کاشت کے لئے ساحلی قطعات کی موزونیت نے فرنچ آبادکاروں کو کھینچ کھینچ کر بلایا۔

دوسرے دور کی مختصر تاریخ یہ ہے۔

(۱) قبائلی علاقے میں ابو لغلہ کی قیادت میں سامراج کے خلاف ۱۸۵۱ء میں بغاوت ہوئی۔ جس نے سامراجیوں کو شدید جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ اس بغاوت میں جنوبی خطہ نے شرکت کی۔

(۲) جنوبی خطہ میں محمد بن عبداللہ نے دوسری بار اعلانِ جنگ کیا اور چار سال تک جدوجہد جاری رہی۔ ۱۸۵۵ء میں اس کا خاتمہ ہوا۔

(۳) اس کے بعد محمد بن عبداللہ کے لڑکے سلیمان ابن محمد نے سامراج سے جنگ چھیڑی اور فرنچ لشکر کو کئی بار شکست فاش دی۔

(۴) الجزائر کے علاقہ جرجرہ کی ایک خاتون فاطمہ نے جہاد شروع کیا اور عرصہ دراز تک فرانسیسوں سے مقابلہ کرتی رہی۔

(۵) قبیلۂ زعاطشہ کے حاکم ابو زیان نے ۱۸۵۲ء میں علمِ جہاد بلند کیا۔ یہ امیر عبدالقادر کے جرنیلوں میں سے تھے۔ سخت و شدید مقابلہ کے بعد شکست پائی، سامراجیوں نے ان کے اہل و عیال تک کو شہید کر دیا۔ ابو زیان کی مردانگی اور ان کے قبیلہ کی بربادی کے واقعات اب تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔

(۶) ۱۸۵۲ء میں سامراجیوں کے خلاف اغواط نامی شہر کے باشندوں نے اعلانِ جنگ کیا۔ سامراجیوں نے انتہائی سفاکی سے کام لے کر اغواط میں قتلِ عام کیا اور آبادی کو ویرانے میں تبدیل کر ڈالا۔

(۷) ۱۸۶۴ء میں سلیمان بن حمزہ بن ابو بکر نے تلوار اٹھائی۔ وہ الجزائر کے مشہور مجاہدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے سامراجی جنرل بوبیرتی کو ٹھکانے لگایا جس نے مسلمانوں کا قتلِ عام کرایا تھا۔ سلیمان بن حمزہ کی شہادت کے باوجود یہ جد و جہد ۱۸۶۹ء تک جاری رہی۔

(۸) ۱۸۷۱ء میں الحاج محمد المقرانی، اور شیخ الطریقت محمد الحداد نے جو رحمانیہ سلسلہ کے مرشد تھے، جنگِ آزادی شروع کی۔ اس بار سارے ساحلی علاقے جہاد میں شامل تھے۔ مگر فرانس سے بڑی تعداد میں لشکر آیا اور ۵ مئی ۱۸۷۱ء کو بویرہ کے معرکے میں المقرانی نے شہادت پائی۔ بہت سے قائدینِ حریت کو دار و رسن کی آزمائش سے گزرنا پڑا اور مجاہد قبائل کو برباد کیا گیا۔

(۹) ۱۹۰۳ء میں بو زیان القلعی نے ایک انقلابی پارٹی جماعت الید السوداء قائم کی اس کی قیادت میں ایک انقلابی تحریک چلائی گئی۔ ہزاروں شہریوں نے اس میں حصہ لیا اور سامراجیوں کے ناقابلِ بیان ظلم و ستم برداشت کئے۔

دوسرے دور کی ان تحریکوں کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ساحلی علاقوں سے الجزائریوں کا تخلیہ جس کا خود سامراجی مسلسل انتظام کرتے رہے تھے، مکمل ہو گیا۔ یہاں تک کہ آٹھ لاکھ سامراج زادوں نے ایک کروڑ الجزائریوں کے ملک میں بہترین علاقوں پر عمل دخل کر لیا۔ آج ایک الجزائری کسان کے پاس اوسطاً بارہ ایکڑ زمین ہے، اس میں بنجر اور سردہ دونوں شامل ہیں، اور ہر سامراج زادے کے پاس (۲۷۵) ایکڑ زمین ہے۔ اور کیسی زمین؟ بے حد زرخیز اور زرپاش۔

تیسرا دور مسلح جد و جہد سے تھکے ہوئے الجزائریوں نے ایک بار ہتھیار رکھ کر قلم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ ۱۹۱۰ء کی بات ہے مسلسل جنگوں اور سامراجی ستم کاریوں نے تہذیب و تمدن کی ساری روشنیاں بجھا دی تھیں۔ مدرسے اور کتب خانے تباہ ہو چکے تھے، اوقاف ضبط کر لئے گئے تھے۔ عربی زبان اور اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لئے فرانسیسی زبان کو جبری طور پر رائج کیا جا رہا تھا۔

تلوار کی جگہ علم و قلم کے اس دور میں سب سے اہم اقدام شیخ عبدالحمید ابن بادیس نے کیا جمعیۃ العلماء المسلمین کا قیام ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے سامراج نے تہذیب و تمدن کو مٹانے کی جو ترکیبیں کی تھیں ان کے خطرناک اثرات علامہ ابن بادیس نے دیکھے تھے۔

(باقی آئندہ)

حضرت نانوتویؒ کی وفات پر

سرسیّد مرحوم کے تاثرات

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات پر سرسید مرحوم نے "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کی اشاعت مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت نانوتویؒ کے متعلق سرسیدؒ نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے وہ الفاظ معاصرانہ چشمک سے مبرا ہونے کے علاوہ حضرت نانوتویؒ کے علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کا جو مقام متعین کرتے ہیں اس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ وہ عقیدتمندانہ جذبات کے غلو سے قطعاً پاک ہیں۔

کسی ایسے شخص کا اپنے کسی ایسے معاصر کے بارے میں اظہار رائے کرنا جو اس شخص کے عقائد و افکار اور رجحانات سے شدید اختلاف رکھتا ہو، ظاہر ہے کہ کس بے لاگ حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے۔

یہ حضرات ایک دوسرے کو ذاتی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ تصفیۃ العقائد کی اس مراسلت سے ہو سکتا ہے جو ان حضرات کے مابین ہوئی ہے۔ اس مراسلت میں سرسیّد اپنے ایک دوست (منشی محمد عارف[1] صاحب) کو خط میں لکھتے ہیں:-

"اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ہے میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔"[2]

---

[1] شاہ محمد عارف مرحوم قصبہ انبہٹہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے، حضرت شاہ ابو المعالیؒ (وفات ۱۱۱۲ھ) کی اولاد میں تھے۔ مولانا عبد اللہ انصاریؒ ناظم دینیات علی گڑھ کالج (مسلم یونیورسٹی) ان کے ہم جد تھے، ۵۵ سال کی عمر میں ۱۹۰۱ء / ۱۳۱۹ھ میں وطن نانوتہ میں انتقال کیا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۴۶ء / ۱۲۶۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کا تعلق جس طرح سرسید مرحوم (۱۳۱۵ھ) سے تھا اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (وفات ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء) اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (وفات ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) سے بھی تھا۔ یہی تعلق حضرت نانوتویؒ اور سرسید مرحوم کے مابین مراسلت کا ذریعہ بنا۔ اپنے زمانہ کے لحاظ سے اچھی علمی استعداد رکھتے تھے۔ علوم قدیمہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ سے بھی شغف تھا۔ علوم جدیدہ میں ان کی دلچسپی کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے بیروت کی چھپی ہوئی متعدد کتابیں ان کو تحفۃً دی تھیں۔ مطالعۂ کتب آخر عمر تک برابر جاری رہا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

[2] تصفیۃ العقائد صفحہ ۳ مکتوب سرسید بنام منشی محمد عارف۔

متذکرہ بالا مکتوب کے جواب میں سرسید کے انہی دوست کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا تھا کہ :۔

"ہاں اس میں شک نہیں کہ سخاوت مآب سید صاحب (سرسید) کی اولوالعزمی اور دردمندی اہلِ اسلام کا معتقد ہوں! اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہارِ محبت کروں تو بجا ہے۔ مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فسادِ عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں"

اس مختصر تقریب کے بعد سرسید کا متذکرہ صدر مضمون درج ذیل ہے۔

افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا، زمانہ بہتوں کو رو چکا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف اور مشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے، مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے، بلکہ چند باتوں میں اُن سے زیادہ۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے، انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتدا ہی سے آثارِ تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع و اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا ؎

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہلِ فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباعِ سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا۔ اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیضِ صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا خود بھی پابندِ شریعت اور سنت تھے، اور لوگوں کو بھی پابند شریعت اور سنت کرنے میں زائد از حد کوشش

حاشیہ صفحہ گذشتہ

منشی محمد عارف صاحب۔ عدالت دیوانی میں ناظر کے منصب پر فائز تھے زمانہ ملازمت میں بجنور کے قیام میں سرسید مرحوم سے تعلقات ہو گئے تھے جو آخر تک قائم رہے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک حج میں رفیقِ سفر بھی رہے، نماز اور دوسرے فرائض کے بڑے پابند تھے ۱۸۹۲ء / ۱۳۱۰ھ میں بنارس سے پنشن لے کر وطن میں مقیم ہو گئے۔ امبہٹہ میں قلمی آموں کا ایک کثیر الاقسام باغ ان کی یادگار باقی ہے۔ (سید محبوب رضوی) لے تصفیۃ العقائد صفحہ ۶ مکتوب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بنام منشی محمد عارف صاحب ۱۲۔

کرتے تھے۔ باایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو
خیال تھا۔ انھیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے
لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا۔ اور ایک
نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات
میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے اسلامی مدرسے قائم ہوئے
وہ کچھ خواہش پیر اور مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن
ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں
ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا
جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے۔
اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے
ہم مولوی محمد قاسم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا
ہو خواہ کسی سے خوشی کا ہو کسی طرح ہوائے نفسانی
یا عناد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام
اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت
کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس
کی پیروی کرتے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا
کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے
واسطے تھا کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات
کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال
سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے، خدا کے
واسطے برا جانتے تھے۔ یہ مسئلہ حب للّٰہ و بغض للّٰہ کا خاص
ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں
کی سی خصلتیں تھیں ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ
محبت رکھتے تھے۔

اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور
شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف
کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسمؒ
اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں
شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز رح سے کچھ کم ہو
الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور
نیکی اور سادہ مزاجی میں ان کا پایہ مولوی محمد اسحاقؒ
سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ
سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔ اور ایسے
شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے
لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس
کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر
کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ
ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے
کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند
کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند
آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف
کرلیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگاری کو قائم
رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے
اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ
مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے
تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔"

حلال روزی کا طلب کرنا بھی
ایک طرح کا جہاد ہے
(حدیث شریف)

عورتوں کی اصلاح

سعودی حکومت کا ایک مبارک اقدام

(از خالد کمال مبارکپوری)

حجاز کی حکومت قابلِ مبارکباد ہے کہ وہ حتی الامکان وضعِ قوانین میں شرعی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتی ہے۔ جس کے مفید اثرات آج دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ مثال کے طور پر چوری کے اسلامی قوانین کو لے لیجیے جس کے نفاذ کے بعد سعودی عرب میں چوری کی وارادات میں حیرت انگیز کمی ہو گئی۔ اسی طرح قتلِ نفس کی وارادات بھی عرب میں برسوں کے بعد سننے میں آتی ہے۔ کیونکہ اسلام کے نزدیک یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا نہایت سخت ہے جس کے دیکھنے یا سننے کے بعد اس کے ارتکاب کی جرأت کرنا جان بوجھ کر اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے صرف چند قوانین یورپ کے پورے قوانین پر بھاری ہیں۔ آج جب کہ یورپ میں ہر ہر منٹ پہ قتل و غارت گری اور خونریزی کے واقعات رونما ہو رہے ہیں عرب میں برسوں کے بعد ہی ایک آدھ ایسے واقعات مشکل سے سننے میں آتے ہیں۔ یورپ کے نام نہاد مہذب قوانین میں اتنی بھی طاقت نہیں جتنی اسلام کے صرف ایک قانون میں ہے۔

مصر اپنی مغرب نوازی میں مشہور رہے جس کی نقل کرتے ہوئے بعض بھولی عرب ریاستیں بھی مصر کی چال چلنے لگتی ہیں اور اپنی چال بھول جاتی ہیں۔ گزشتہ دنوں اپنی مغرب نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے مصر نے چوری، ڈاکہ وغیرہ کے مجرموں کے لئے اصلاحی قید خانہ بنایا تھا لیکن جب ایک لڑکے نے پندرہ مرتبہ اصلاح خانہ جانے کا ریکارڈ توڑ کر اپنی مصلحہ سے صاف الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ "اگر آپ یہ چاہتی ہوں کہ میں چوری نہ کروں تو میرا ہاتھ کاٹ لیجیے ورنہ مجھ سے باز آنے کی امید رکھنی فضول ہے۔" تو ان کو اپنی مغرب نوازی کا پورا پورا اندازہ ہو گیا اور انہوں نے بڑی شدت سے اسلامی قانون کی ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ بحث و تمحیص کے بعد وہاں کی حکومت نے چوری کے مجرمین کا ہاتھ کاٹنے کے لئے اسلامی قوانین کا سہارا لیا۔ جیسا کہ کچھ دنوں پہلے اخبار میں یہ خبر پڑھنے میں آئی تھی۔

اگرچہ سعودی عرب میں بھی اسلامی قوانین پورے

طور پر لاگو نہیں ...
حکومتوں پر نظر پڑتی
میں غنیمت اور ...
عرب کا نام لے کر اپنا لو ...
حکومت بڑی تیزی سے اسلامی قوانین کو پورے طور پر عرب میں نافذ کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے اور چاہتی ہے کہ جلد از جلد سعودی عرب میں اسلام کے جملہ قوانین نافذ ہو جائیں۔ زندگی کے ہر ہر مراحل میں اسلامی قوانین کا سہارا لے کر دنیا کو بتلایا جائے کہ اسلام ایک بہترین نظام زندگی، بہترین مذہب اور بہترین لائحۂ عمل ہے۔ جس میں امن و سکون کی کثرت اور غم و بحران کا فقدان ہے۔

اس سلسلہ کی ایک کڑی عورتوں کی اصلاح اور ان کو اسلامی قانون کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کی مہم ہے جو وہاں کی وزارت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جانب سے چلائی گئی ہے۔ اس کی عربی قرارداد کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے، امید کہ ذوق سے پڑھا جائے گا۔ اور عورتوں کے معاملہ میں ہمدردی رکھنے والے حلقوں میں اس پر غور و خوض کیا جائے گا۔

عورتوں کی بڑھتی ہوئی بے حیائی اور آداب اسلامی کی مخالفت کے پیش نظر وزارت امر بالمعروف کے صدر شیخ عبدالملک بن ابراہیم نے ایک پریس کانفرنس بلائی جو عورتوں کے گھر سے بن ٹھن کر نکلنے اور بے پردگی کا مظاہرہ کرنے کے معاملہ میں غور و فکر کرے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں جن میں عورتیں اسلامی احکام کی خلاف ورزی کر کے فتنہ و فساد برپا کرتی ہیں

... طرح برداشت
... دے دی
... سے باہر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح
... جب آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے گندے جراثیم سماج کو اپنی لپیٹ میں لے کر انسانیت گلا گھونٹ دیتے ہیں، چہ جائے کہ حرم محترم جیسے متبرک مقام پر اس بیہودگی کو شہ دی جائے۔

آپ حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ عورت کے لئے اپنا گھر سب سے بہتر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شرعی ضرورت اسے گھر سے نکلنے کے لئے مجبور کر دے۔ حتیٰ کہ عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا باوجود مسجد کی نماز کے ثواب زائد ہونے کے بہتر ہے، چنانچہ ام حمیدؓ نے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت مانگی جس کے جواب میں آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عجیب معاملہ ہے کہ تم میرے پیچھے نماز پڑھنا چاہتی ہو حالانکہ تمہارا حجرہ میں نماز پڑھنا بہتر ہے بڑے گھر میں نماز پڑھنے سے، اسی طرح تمہارا بڑے گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے قوم کی مسجد میں نماز پڑھنے سے۔ اور محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنا بہتر ہے میری مسجد میں آ کر نماز پڑھنے سے۔

آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلہ میں ایک اور حدیث کو لیجئے۔

خیر مساجد النساء قعر بیوتھن۔ عورتوں کی بہتر مساجد ان کے گھر کی چار دیواری ہیں

ایک اور حدیث بھی ملاحظہ فرمائیے۔

لا تمنعوا النساء کم المساجد و بیوتھن خیر لھن۔ عورتوں کو مسجد جانے سے نہ روکو البتہ یہ ہے کہ ان

کا گھر ان کے لئے زیادہ بہتر ہے۔
حضرت عائشہؓ اپنے دور کی عورتوں کی بے احتیاطی اور تجاوز کو دیکھ کر فرماتی ہیں۔
لوعلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما احدث النساء بعدہ لمنعھن المساجد۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عورتوں نے جو گل کھلائے اس کی تفصیل اگر آپ دیکھتے ضرور ان کو مسجد میں جانے سے روک دیتے۔
بلا ضرورت شرعی عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
المراۃ عورۃ وانھا اذا خرجت استشرفھا الشیطان وانھا اقرب ماتکون الی اللہ وھی فی قعر بیتھا۔
عورت ستر ہے جب وہ نکلتی ہے تو اس پر شیطان اپنا جادو چلاتا ہے۔ عورت کے لئے (شیطان سے بچانے) اللہ سے زیادہ قریب رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کی چہار دیواری میں رہے۔
اسی طرح کا ایک اور ارشادِ نبوی ملاحظہ فرمائیے:۔
المراۃ تقبل فی صورۃ الشیطان وتدبر فی صورۃ الشیطان۔
عورت شیطان کی شکل میں سامنے آتی ہے اور شیطان ہی کی شکل میں گزرتی ہے۔
عورتوں کے گھر سے نکلنے کے سلسلہ کی ایک اور حدیث ملاحظہ کیجئے۔
مامن امراۃ تخرج فی شھرۃ من الطیب فینظر الرجال الیھا الا لم تزل فی سخط اللہ حتی
جب کوئی عورت گھر سے خوشبو لگا کر نکلتی ہے جس کی وجہ سے لوگ اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں تو وہ اس وقت تک اللہ

ترجع الی بیتھا
کی ناراضگی میں رہتی ہے جب تک کہ اپنے گھر واپس نہ لوٹ آئے۔
مشہور عالم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عورتوں کو جمعہ کے دن مسجد سے نکال دیا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔
اخرجوھن من حیث اخرجھن اللہ فیبوتھن خیرلھن۔
اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کو جہاں سے نکالا ہے وہاں سے تم بھی ان کو نکالو۔ ان کا گھر ان کے لئے بہتر ہے۔
اس قسم کے آثار و احادیث کتابوں میں کثرت سے موجود ہیں اور عورتوں سے پیدا ہونے والے مردوں کیلئے فتنے بھی مشہور و معروف ہیں۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
ماترکت بعدی فتنۃ اضر علے الرجال من النساء۔
میں نے اپنے بعد عورتوں سے بڑھ کر کوئی فتنہ مرد کے لئے نقصان دہ نہیں چھوڑا۔
ایک اور حدیث میں آپ نے عورتوں کے فتنہ کو ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔
اتقوا الدنیا واتقوا النساء فان اول فتنۃ بنی اسرائیل کانت بالنساء۔
دنیا سے اور عورتوں سے (جہاں تک ہو سکے) بچو کیونکہ بنی اسرائیل کے فتنہ کی ابتداء عورتوں سے ہوئی تھی
ان اخبار و احادیث کو سامنے رکھ کر زیرِ موضوع آج کے دور کی عورتوں کے فتنوں کو دبانے اور عورتوں کی اصلاح کے لئے کوئی مناسب حل تلاش کرنے کی درخواست کی۔ اس کانفرنس میں ادارہ امر بالمعروف کی طرف سے عبداللہ عقلا شیخ علی فراج۔ اداز

طور پر لاگو نہیں ہیں اس کے باوجود جب عرب کی دوسری حکومتوں پر نظر پڑتی ہے تو سعودی عرب ان سب میں غنیمت اور کامیاب نظر آتی ہے جو اسلام اور عرب کا نام لے کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں سعودی حکومت بڑی تیزی سے اسلامی قوانین کو پورے طور پر عرب میں نافذ کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے اور چاہتی ہے کہ جلد از جلد سعودی عرب میں اسلام کے جملہ قوانین نافذ ہو جائیں۔ زندگی کے ہر مراحل میں اسلامی قوانین کا سہارا لے کر دنیا کو بتلایا جائے کہ اسلام ایک بہترین نظام زندگی، بہترین مذہب اور بہترین لائحہ عمل ہے۔ جس میں امن و سکون کی کثرت اور غم و بحران کا فقدان ہے۔

اس سلسلہ کی ایک کڑی عورتوں کی اصلاح اور ان کو اسلامی قانون کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کی مہم ہے جو وہاں کی وزارت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جانب سے چلائی گئی ہے اس کی عربی قرارداد کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے، امید کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اور عورتوں کے معاملہ میں ہمدردی رکھنے والے حلقوں میں اس پر غور و خوض کیا جائے گا۔

عورتوں کی بڑھتی ہوئی بے حیائی اور آداب اسلامی کی مخالفت کے پیش نظر وزارت امر بالمعروف کے صدر شیخ عبدالملک بن ابراہیم نے ایک پریس کانفرنس بلائی جو عورتوں کے گھر سے بن ٹھن کر نکلنے اور بے پردگی کا مظاہرہ کرنے کے معاملہ میں غور و فکر کرے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں جن میں عورتیں اسلامی احکام کی خلاف ورزی کر کے فتنہ و فساد برپا کرتی ہیں

خاص کر حرم کے اندر تو ان بے حیائیوں کو کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ فتنہ کو جب ڈھیل دے دی جائے تو وہ گرفت سے باہر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح برائی کو جب آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے گندے جراثیم سماج کو اپنی لپیٹ میں لے کر انسانیت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں، چہ جائے کہ حرم محترم جیسے متبرک مقام پر اس بیہودگی کو شہ دی جائے۔

آپ حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ عورت کے لئے اپنا گھر سب سے بہتر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شرعی ضرورت اسے گھر سے نکلنے کے لئے مجبور کر دے۔ حتیٰ کہ عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا باوجود مسجد کی نماز کے ثواب زائد ہونے کے بہتر ہے، چنانچہ ام حمیدؓ نے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت مانگی جس کے جواب میں آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عجیب معاملہ ہے کہ تم میرے پیچھے نماز پڑھنا چاہتی ہو حالانکہ تمہارا حجرہ میں نماز پڑھنا بہتر ہے بڑے گھر میں نماز پڑھنے سے، اسی طرح تمہارا بڑے گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے قوم کی مسجد میں نماز پڑھنے سے۔ اور محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنا بہتر ہے میری مسجد میں آکر نماز پڑھنے سے۔

آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلہ میں ایک اور حدیث کو لیجئے۔

خیر مساجد النساء قعر بیوتھن۔ عورتوں کی بہتر مساجد ان کے گھر کی چار دیواری ہیں

ایک اور حدیث بھی ملاحظہ فرمائیے۔

لا تمنعوا نساءکم المساجد وبیوتھن خیر لھن۔ عورتوں کو مسجد جانے سے نہ روکو البتہ بہتر یہ ہے کہ ان

کا گھران کے لئے زیادہ بہتر ہے۔

حضرت عائشہؓ اپنے دور کی عورتوں کی بے احتیاطی اور تجاوز کو دیکھ کر فرماتی ہیں۔

لو علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما احدث النساء بعدہ لمنعھن المساجد۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عورتوں نے جو گل کھلائے اس کی تفصیل اگر آپ دیکھتے ضرور ان کو مسجد میں جانے سے روک دیتے۔

بلا ضرورت شرعی عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

المرأۃ عورۃ وانہا اذا خرجت استشرفہا الشیطان وانہا اقرب ما تکون الی اللہ وھی فی قعر بیتہا۔

عورت ستر ہے جب وہ نکلتی ہے تو اس پر شیطان اپنا جادو چلاتا ہے۔ عورت کے لئے (شیطان سے بچانے) اللہ سے زیادہ قریب رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کی چہار دیواری میں رہے۔

اسی طرح کا ایک اور ارشاد نبوی ملاحظہ فرمائیے:-

المرأۃ تقبل فی صورۃ الشیطان وتدبر فی صورۃ الشیطان۔

عورت شیطان کی شکل میں سامنے آتی ہے اور شیطان ہی کی شکل میں گزرتی ہے۔

عورتوں کے گھر سے نکلنے کے سلسلہ کی ایک اور حدیث ملاحظہ کیجئے۔

ما من امرأۃ تخرج فی شھرۃ من الطیب فینظر الرجال الیھا الا لم تزل فی سخط اللہ حتی ترجع الی بیتہا

جب کوئی عورت گھر سے خوشبو لگا کر نکلتی ہے جس کی وجہ سے لوگ اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں تو وہ اس وقت تک اللہ کی ناراضگی میں رہتی ہے جب تک کہ اپنے گھر واپس نہ لوٹ آئے۔

مشہور عالم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عورتوں کو جمعہ کے دن مسجد سے نکال دیا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔

اخرجوھن من حیث اخرجھن اللہ فبیوتھن خیر لھن

اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کو جہاں سے نکالا ہے وہاں سے تم بھی ان کو نکالو۔ ان کا گھران کے لئے بہتر ہے۔

اس قسم کے آثار و احادیث کتابوں میں کثرت سے موجود ہیں اور عورتوں سے پیدا ہونے والے مردوں کیلئے فتنے بھی مشہور و معروف ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

ما ترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء۔

میں نے اپنے بعد عورتوں سے بڑھ کر کوئی فتنہ مرد کے لئے نقصان دہ نہیں چھوڑا۔

ایک اور حدیث میں آپ نے عورتوں کے فتنہ کو ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔

اتقوا الدنیا واتقوا النساء فان اول فتنۃ بنی اسرائیل کانت بالنساء۔

دنیا سے اور عورتوں سے (جہاں تک ہو سکے) بچو کیونکہ بنی اسرائیل کے فتنہ کی ابتداء عورتوں سے ہوئی تھی

ان اخبار و احادیث کو سامنے رکھ کر زیر موضوع آج کے دور کی عورتوں کے فتنوں کو دبانے اور عورتوں کی اصلاح کے لئے کوئی مناسب حل تلاش کرنے کی درخواست کی۔ اس کانفرنس میں ادارہ امر بالمعروف کی طرف سے عبداللہ عقلا شیخ علی فراج۔ ادارہ

حج کی جانب سے شیخ صالح بن عثیمین، ادارہ تعلیم کی جانب
سے عبدالرحمٰن نوزان، ادارہ اوقاف مکہ کی جانب سے
عبداللہ بن بلیح، شہر میں محکمۂ پولیس کی جانب سے محمد خدیری
ادارہ صحت کی جانب سے احمد محمد صائغ، ادارہ حرم
کی جانب سے شیخ یوسف نافع اور حرم کے محکمۂ پولیس
کی جانب سے یوسف دانش شریک ہوتے۔ یہ کانفرنس
۱۴ جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۳ھ بروز سنیچر وزارت امر
بالمعروف کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس مجلس میں
حسب ذیل تجاویز پاس ہوئیں۔

(۱) عورتوں کے حرم میں داخل ہونے کے لئے
تین دروازے مخصوص کر دیئے جائیں، باب ابراہیم
باب زیارت، باب علی، تاکہ حرم کے اندر عورتوں کی
دیکھ بھال کرنے والا محکمہ پورے طور پر ان کے آداب
دینی کا مطالعہ کر سکے۔ اور جو عورت آداب دینی کے
خلاف کوئی اقدام کرے تو اس کو حرم میں داخل ہونے
سے روک دیا جائے۔

(۲) وہی عورت حرم میں داخل ہو سکتی ہے جو اترا کر
نہ چلے، عطر وغیرہ لگا کر نہ آئے۔ اور ستر پوش لباس پہنے
ہو جس سے مردوں کی نظر اس کی جانب متوجہ نہ ہو سکے
ایسا لباس نہ ہو کہ جلد نظر آئے، یا اتنا تنگ نہ ہو کہ اس
کے اتار چڑھاؤ ظاہر ہوں۔ پیر بھی چھپے ہوئے ہوں۔ اس
کے پیر میں ایسا موزہ ہونا چاہیئے جو اس کی جلد کے رنگ
کا نہ ہو اور وہ عورت آداب حرم اور دینی تعلیم سے واقف
ہو۔ اگر مذکورہ بالا حدود کی خلاف ورزی کرتی ہوئی کوئی عورت
پائی گئی تو اس محکمہ کے نگراں سے سخت باز پرس کی جائے گی۔

(۳) سرکاری وغیر سرکاری مطوفین (طواف کرانے والے)
کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ان عورتوں کو طواف کرنے سے
باز رکھیں جو اپنے آداب و احترام کو ملحوظ نہ رکھیں۔
اگر اس کی خلاف ورزی ہوئی تو غیر سرکاری مطوفین
کو ایک مدت کے لئے معطل اور سرکاری مطوفین پر
جرمانہ کیا جائے گا۔

(۴) ڈاکٹروں اور حکیموں کے لئے ضروری ہوگا
کہ وہ کسی عورت کا کوئی ظاہری حصہ بغیر کسی دوسری
عورت کی موجودگی کے ہرگز نہ کھولیں اور باطنی حصہ
تو بوقت ضرورت اس کے کسی محرم کی موجودگی ہی میں
کھول سکتا ہے تاکہ کسی قسم کا وہم و گمان نہ ہو جیسا کہ
ہماری شریعت محمدیہ ﷺ نے حکم فرمایا ہے۔ یہ مجاز کسی ڈاکٹر
کو اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ کوئی لیڈی ڈاکٹر نہ ہو
لیکن اگر کوئی ماہر لیڈی ڈاکٹر موجود ہو تو ڈاکٹر کو ہرگز
یہ مجاز نہ ہوگا۔

(۵) یہ تمام آداب و قوانین ہر اس عورت کے
لئے ضروری ہوں گے جو اپنے گھر سے باہر نکلے۔ اگر
کوئی عورت گھر سے باہر ان قوانین و آداب کی خلاف
ورزی کرتی ہوئی پائی گئی تو عورت اور اس کے مربی کو
سزا و جزا کے لئے عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔

(۶) عورتوں سے بیع و شری کرنے والے تاجروں
کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں وزارت امر
بالمعروف کا ہاتھ بٹائیں اور جہاں تک ہو سکے وہ ان
برائیوں کی بیخ کنی میں اس کا ساتھ دیں۔ اگر اس سلسلہ
میں انہیں اپنی دوکانداری بگڑنے کا خدشہ ہو تو بھی اس
کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ امر بالمعروف کسی خاص
آدمی یا کسی خاص شعبہ کے ذمہ نہیں ہے بلکہ حسب
استطاعت ہر ایک مسلمان پر ضروری ہے۔ لہٰذا دوکانداری
کی پرواہ کئے بغیر امر بالمعروف کی کوشش کرنا استطاعت

(بقیہ بر صـ ۲۲)

اِنسانیت کے چراغ

اَزمولانا بدرالدین صاحب (فاضل دیوبند)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مرتبہ ینہ میں سخت قحط پڑا، اور غلہ گراں ہوگیا۔ حضرت عثمان ضی اللہ عنہ غلہ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کے ہت سے اونٹ غلہ کے لدے ہوئے اسی زمانے ں مدینہ میں آئے تو امیرالمومنین حضرت عمر رض نے ضرت عثمان رض کو بلا کر فرمایا کہ اس وقت مخلوق قحط ا وجہ سے بہت تکلیف میں مبتلا ہے۔ لہٰذا تمہارا غلہ باہر سے آیا ہے وہ تم حکومت کے ہاتھ بیچ ڈالو ہیں اسے غریبوں میں تقسیم کرسکوں۔

حضرت عثمان رض نے فرمایا ضرور، لیکن میں غلہ ں کے ہاتھ فروخت کروں گا جو زیادہ قیمت دے گا۔

حضرت عمر رض نے غلہ کی معقول قیمت پیش کی، مگر ضرت عثمان اس پر رضامند نہ ہوئے۔ اور یہی فرمایا یں اتنی تھوڑی قیمت پر فروخت نہیں کرسکتا۔ آخر ، حضرت عمر رض نے اس سے دوگنی قیمت دینی چاہی نہوں نے قبول نہیں کیا۔ اور فرمایا:-

امیرالمومنین مجھے افسوس ہے کہ میں اب بھی اپنا فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، کیونکہ جو ت آپ مجھے دے رہے ہیں یہ اب بھی بہت کم ہے اور حضرت عمر رض کے پاس سے اُٹھ کر چلے آئے۔

گھر آتے ہی اپنے غلاموں کے ذریعہ سارے مدینہ میں اعلان کرادیا کہ عثمان کے یہاں کافی غلہ آیا ہوا ہے جس غریب کو ضرورت ہو آکر مفت لے جائے۔

شام تک پورا غلہ اس طرح مفت تقسیم کردیا۔

مغرب کی نماز میں جب حضرت عمر رض سے ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے، امیرالمومنین آپ مجھے میرے غلہ بہت تھوڑی قیمت دے رہے تھے میں نے خدا کی خدا کے ہاتھ اپنا غلہ بڑی گراں قیمت پر فروخت کردیا اور میں بڑے نفع میں رہا۔

عراق کی جنگوں میں قادسیہ کا معرکہ بہت مشہور ہے کیونکہ اس میں ایرانیوں نے اپنی بہت بڑی فوج کو مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے جمع کیا تھا۔ یہ معرکہ حضرت عمر رض کے زمانہ میں پیش آیا۔ اور دشمن کی کثرت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس میں مسلمانوں کو فتح دی حضرت عمر رض کو اس کی فتح کی بہت فکر تھی۔ جنگ کے زمانے میں روزانہ صبح ہی صبح مدینہ سے باہر نکل جاتے اور قادسیہ کی طرف سے قاصد کی راہ تکتے۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ قادسیہ کی طرف سے ایک سوار سرپٹ چلا آرہا ہے۔ اتفاق سے یہ قاصد حضرت عمر رض

سے واقف نہ تھا۔ البتہ مسلمانوں کی فتح کی خوشخبری خلیفہ کو سنانے آیا تھا۔

حضرت عمرؓ نے بڑھ کر پوچھا۔ "کدھر سے آئے ہو؟" معلوم ہوا، حضرت سعدؓ جو قادسیہ کی جنگ میں مسلمانوں کی فوج کے جرنیل تھے ان کا بھیجا ہوا ہے۔ اور فتح کی خوشخبری لایا ہے۔ اسے جلدی خلیفہ کو سب حال سنانا ہے۔

وہ برابر تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ اور حضرت عمرؓ اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے اور حالات پوچھتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے شہر میں گھسے تو جو سامنے آتا آپ کو امیر المومنین کہہ کر پکارتا۔ قاصد نے جو دیکھا تو بے چارہ سہم گیا۔ اور بولا۔ آپ نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا کہ مجھ سے یہ گستاخی نہ ہوتی۔

آپ نے فرمایا۔ "کوئی بات نہیں۔ تم کہے جاؤ۔" غرض اسی طرح گھر تک آئے۔ پھر سب مسلمانوں کو فتح کی خوشخبری سنائی۔ آخر میں فرمایا۔

"مسلمانو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو غلام بنا کے رکھوں۔ میں تو خود خدا کا بندہ ہوں۔ اگر میں اس طرح تمہارا کام کروں کہ تم سکھ چین سے اپنے گھروں میں رہو سہو تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔ لیکن اگر میں یہ چاہوں کہ تم میرے دروازے پر حاضری دو تو یہ میری بدبختی ہے۔ میں تمہیں انسانوں کی طرح رہنا سکھانا چاہتا ہوں۔ خالی باتوں سے نہیں، بلکہ اپنے عمل سے

بقیہ صفحہ (۲۹) ابن سعود اور فتح ریاض

ابن سعود کے پاس جو انگلش افسر آیا اس کا نام شکسپیر تھا۔ یہ کویت میں برطانوی قونصل تھا۔ جرمنی نے مدینہ اور بصرہ سے ترکی والی کے ہمراہ اپنے قاصد بھیجے۔

ابن سعود یہ خوب سمجھ گیا تھا کہ انگریزوں اور جرمنوں میں جلد جنگ چھڑے گی۔ مگر وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ دونوں میں سے کس کا ساتھ دے۔ جس سے وہ معاہدہ کرلے۔

یہ بہت مشکل مسئلہ تھا۔ اور اس کا حل صرف اس پر مبنی تھا کہ وہ یہ جان سکے کہ دونوں میں کس کا پلہ بھاری رہے گا۔

اس نے ترکوں سے گفت و شنید کی جو جرمنی کے طرفدار تھے۔ اور ان کو تیز رفتار اونٹ بھیجے۔ اس نے شکسپیر سے گفت و شنید کی اور اس سے زر و اسلحہ حاصل ہوئے۔

افریقہ میں اِسلام کی اشاعت

(پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن۔ اُردو کالج۔ کراچی)

قسط نمبر ۲

دسویں صدی عیسوی تک ابی سینیا میں صرف چند عرب خاندان ساحلی علاقوں میں رہتے تھے ۱۳۰۰ء میں ابو عبداللہ محمود کی قیادت میں ایک تبلیغی وفد ابی سینیا میں بھیجا گیا۔ دوسرے ہی سال تقریباً دو لاکھ افراد کی فوج جمع کر کے عبداللہ محمود "امحارہ" کی سلطنت پر حملہ آور ہوا۔ سیفہ ارعد بادشاہ (۱۳۴۲ء ۱۳۷۰ء) نے مسلمانوں کو بری طرح کچلا اور تمام مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا۔ جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کرنے سے انکار کیا انہیں جلا وطن کر دیا۔ لیکن ساحلی علاقوں میں مسلمانوں نے طاقت حاصل کرنا شروع کی اور کچھ عرصہ کے بعد ابی سینیا کے عیسائیوں کو اندرونی علاقے سے مار بھگایا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ (BEL DA MARYAM) (۱۴۶۸ - ۱۴۷۸ء) نے اپنی حکومت کا بیشتر دور مسلمانوں سے جنگ کرنے میں گزارا۔

مسلمان زیادہ تر ساحلی علاقوں میں تجارت کرتے تھے، یا گلہ بانی کر کے گذر اوقات کرتے تھے، پندرھویں صدی کے آخر میں یہ لوگ زیادہ تر ابی سینیا کی شمالی سرحدوں کے نشیبی علاقوں میں منتشر طور پر آباد تھے ان کی آبادی بحرِ احمر سے سینار تک تھی۔ عدل احمد گراں نے جو ایک "آبجو" پادری کا بیٹا تھا اور مسلمان ہو گیا تھا اپنے آپ کو مضبوط کر کے ۱۵۲۸ء سے لے کر ۱۵۴۳ء تک حبش پر یلغار کرتا رہا۔ اس بابرکت ہستی کی ذاتی کرامات کے باعث بے شمار عیسائی مسلمان ہو گئے۔ یہاں تک کہ بہت سے عیسائی امراء اور شہزادے بھی اسلامی صف میں شامل ہو گئے۔ مشہور عیسائی مورخ آرنلڈ کہتا ہے کہ ۱۵۱۳ء میں ایک مسلمان جرنیل عیسائیوں کے ظلم کی وجہ سے عیسائی بن گیا۔ لیکن حقیقت میں اس نے دینِ محمدیؐ کو فراموش کیا۔ اس نے عیسائی فوج میں رہ کر بیس ہزار مسلمان بنائے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

لیکن پرتگالیوں کی مدد سے حبشہ کے عیسائیوں نے سلطان احمد گراں کو ۱۵۴۳ء میں قتل کر دیا اور مسلمانوں کا زور کم ہو گیا۔ مگر عیسائی کلیساؤں کی نا اتفاقیوں اور بد انتظامیوں کی وجہ سے اسلام نے

پھر دوبارہ جڑ پکڑنی شروع کی اور ۱۴۳۲ء کے بعد ملک میں افراتفری کا دور رہا اور مسلمانوں کی آبادی تیزی کے ساتھ جنوب کی طرف بڑھتی رہی۔ سترھویں صدی میں ابی سینیا میں مسلمانوں کی آبادی ۳/۱ ہو گئی۔

حبشہ میں اسلام کی کامیابی کی وجہ عیسائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا کردار، ان کی بلند اخلاقی اور جذبۂ ایمان تھا۔ مشہور سیاح روپل (RUPPELL) کا کہنا ہے کہ جب کبھی کسی ملازمت میں ایماندار آدمی کی ضرورت ہوتی تھی تو سب سے پہلے مسلمانوں کو منتخب کیا جاتا تھا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ مسلمان عیسائیوں سے زیادہ حوصلہ مند، صاحب کردار، باعمل اور جفاکش تھے۔

مسٹر پلاوڈن (PLOWDEN) جو ابی سینیا میں حکومت برطانیہ کی جانب سے ۱۸۴۴ء-۱۸۹۰ء تک کونسل تھے بیان کرتے ہیں کہ "بتن (TIGNE) قبیلے جو عرض بلد ۱۷ء اعرض بلد کے درمیان مساوِح کے شمال مغرب میں آباد تھے، گزشتہ سو سال کے اندر مسلمان ہو چکے تھے۔ اور وہ تمام عیسائی تھے۔

۱۸۵۳ء میں (THEODORE) بادشاہ کے تخت نشین ہونے پر مسلمانوں نے راس علی کے زمانے میں جو راس ریجنٹ تھے، کافی ترقی کی۔ گو وہ خود عیسائی تھا لیکن اس نے بڑی بڑی ملازمتوں پر مسلمانوں کو مقرر کیا اور اس زمانے میں وسطی ابی سینیا کی تقریباً نصف آبادی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

آگے چل کر کئی مورخوں نے تحریر کیا ہے کہ اس صدی کے آخری حصوں میں بیشتر تجارتی اداروں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ اور بڑے شہروں میں ان کی اکثریت ہو گئی تھی۔ ۱۸۷۵ء سے لے کر ۱۸۸۲ء میں مصر اور ابی سینیا کے مابین جنگ کی وجہ سے بیرونی افواج یعنی مسلمانوں کے خلاف ابی سینیا کے عوام متنفر ہو گئے تھے۔ ۱۸۷۸ء میں بادشاہ جہان نے ابی سینیا کے تمام پادریوں کی ایک کانفرنس طلب کی اور ۱۸۸۰ء تک اس نے تقریباً ۵۰۰۰۰ مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مظلوم عوام، اسلام کی جانب زیادہ راغب ہونے لگے اور خاموشی کے ساتھ بے شمار مسلمان ہو گئے۔ "اسلام ان افقوپیا" کے مصنف کی تحریر کے مطابق تقریباً تین لاکھ عیسائی مسلمان ہو گئے۔ "کافہ" کا بادشاہ "اٹالیا" مہدی کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا۔

اس نے ۱۸۹۷ء تک عیسائیوں کا مقابلہ کیا لیکن آخرکار شہنشاہ (MENALIK) کے ہاتھوں قید ہوا، اور عیسائیت دوبارہ ملک حبش میں رائج ہو گئی۔ لیکن اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے عیسائیوں نے پھر گھٹنے ٹیک دیے۔ متعدد جنوبی قبیلوں نے جو حرار اور سرامول میں آباد تھے اسلام کی فوقیت کو تسلیم کر لیا اور کلمۂ توحید کے قائل ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ اگارہ اور گالا کے بہت سے بت پرست قبیلوں میں اسلام کا نور پھیلنا شروع ہوا۔ بیسویں صدی کے شروع میں بڑی تیزی کے ساتھ ابی سینیا کے جنوب میں، رودلف جھیل کے آس پاس اور یوگانڈا میں بت پرست قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا۔

افریقہ میں رومن صوبے جن میں عیسائی رہتے تھے ساحل سے زیادہ سے زیادہ ۸۰ یا ۱۰۰ میل تک پھیلے ہوئے تھے، وجہ یہ تھی کہ جنوب میں صحرائے اعظم کے بیابان، لق و دق ریگستانی علاقے، آبادی کے لئے نہایت موزوں تھے۔ پانچویں صدی عیسوی میں جب سلطنت روما کے زوال کا آغاز ہوا تو جنوب کے ریگستانی علاقوں کے غیر اہل کتاب اور ملحد مُور، نومیڈین اور لیبیائی علاقے کے قبیلوں نے شمالی ساحلی شہروں پر یلغار شروع کی اور چند سالوں میں ہزاروں کلیساؤں کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت ان علاقوں میں عیسائیت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا۔

لیکن مسلمان مورخوں کی تحریروں کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ روما کے زوال کے بعد اور جنوبی قبیلوں کے ہاتھوں کلیساؤں کی بربادی کے باوجود بھی وہاں متعدد گرجا گھر موجود تھے اور شہروں کی آبادی کے بیشتر لوگ عیسائی مذہب کے ماننے والے تھے۔ یہاں عیسائی مورخ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ شمالی افریقہ میں صرف بت پرست اور ملحد لوگ ہی مسلمان ہوئے۔ عیسائی تو تھے ہی نہیں۔ یہ غلط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں سے ربط قائم ہو جانے کے بعد بے شمار عیسائی بہ رضا و رغبت مسلمان ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ جنوب میں بھی اسلام کی شمع روشن کرنے کے ذمہ دار یہی عیسائی تھے۔ یہ بھی کہنا غلط ہے کہ شمالی مغربی افریقہ میں پیش قدمی کے وقت مسلمانوں نے تمام کلیساؤں کو برباد کیا اور عیسائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے برعکس تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے غیر مذاہب کی عبادت گاہوں کی حرمت ہمیشہ برقرار رکھی۔ اور ضعیفوں، بچوں اور عورتوں پر کبھی ہاتھ نہ اٹھایا، وہ ان کو پناہ دیتے تھے جو ہتھیار ڈال دیتے تھے یا اسلام قبول کر لیتے تھے۔ صرف ان کو قتل کرتے تھے جو مسلمانوں کو قتل کرنے کے ارادہ سے آتے تھے، یا مزاحمت پر آمادہ ہوتے تھے۔ تاریخ اسلام میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں جب کہ مسلمانوں نے صلح کو جنگ پر ترجیح دی اگرچہ صلح میں ان کا نقصان رہا۔

اب میں آپ کی توجہ بربری علاقہ کے غیر اہل کتاب اور ملحد قبیلوں میں اسلام کی اشاعت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں نہ زیادہ مواد میسر ہے اور نہ اس کے متعلق قابل ذکر تحقیق ہے میں اس ضمن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بربر قومیں ایک عرصہ تک عربوں کی پیش قدمی کا مقابلہ کرتی رہیں۔ آخر ۷۰۳ء میں بربروں کی آخری قوت مدافعت ختم ہو گئی۔ اور بربری پرنسس الکاہینہ نے مسلمان فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اور خود لڑتی ہوئی ماری گئی۔ اس طرح شمالی افریقہ کے مکمل حصے پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔ بہت سے بربری باشندے عربی افواج میں شریک کر لئے گئے یا ان کو برابر کا رتبہ دیا گیا۔ عرب مختلف شہروں میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ ان میں بہتوں نے بربری لڑکیوں سے شادی کر لی جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھتی رہی۔

مشہور سپہ سالار موسیٰ بن نصیر فاتحِ اعظم افریقہ نے خلیفہ عبدالملک سے اجازت لے کر اپنی جیب خاص کی رقم سے بے شمار غلام خریدے جنھوں نے مسلمان ہونے کا وعدہ کیا۔ چند سالوں میں مسلم غلاموں کی ایک بڑی تعداد موسیٰ بن نصیر کے پاس جمع ہو گئی۔ ۷۱۸ء میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اسمٰعیل ابن عبداللہ کو شمالی افریقہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے بربر قوم کو دعوتِ اسلام پیش کی۔ مختلف تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بربر علاقوں میں افواجِ اسلام کو ملا کر چالیس ہزار مسلمان تھے۔ جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں لیکن چند سالوں میں اشاعتِ اسلام نے اتنا زور پکڑا کہ مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہو گئی۔ اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں "المورادو" (ALMORAVID) کی تحریک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہزاروں بربر قبیلے آغوشِ اسلام میں آ گئے۔

شیوخِ تبلیغ گیارھویں صدی کے شروع میں الحاج یحییٰ بن ابراہیم جو "شہناجا" قبیلہ کے سردار اعلیٰ تھے، عبدالرحمٰن بن یٰسین کے ہمراہ تبلیغ اسلام کے لئے نکل پڑے۔ لیکن صحارا کے علاقے میں ان کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن یہ حوصلہ مند مردِ مجاہد ہمت نہ ہارا اور جنوب کی طرف چلتا رہا۔ آخر سوڈان میں پہنچ کر تبلیغ کا کام شروع کیا۔ عبداللہ بن یٰسین اپنے چند شاگردوں کے ساتھ دریائے سینیگل کے کنارے گوشہ نشین ہو گئے۔ وہاں پر ہزاروں افراد اطراف وجوانب سے آ کر مرید ہوتے رہے اور چند عرصہ کے بعد تمام (LAMTUNA) لامتونا قبیلہ جو شہناجا قبیلہ کا ایک خاص جزو تھا مسلمان ہو گیا۔ جن کی تعداد تقریباً ۔۔۔ا تھی۔ عبداللہ بن یٰسین نے ۱۰۴۲ء میں اپنے مریدوں کا وفد بنایا۔ جن کو "مرابطین" یا "المورادو" کہتے ہیں۔ اپنے مریدوں کی مدد سے انہوں نے ہزارہا ملحد قبیلوں کو مسلمان بنایا سر ٹامس آرنلڈ کا یہ کہنا کہ مرابطین نے وسطی افریقہ اور سینیگل کے علاقوں میں ملحدوں اور مشرکوں کو زبردستی مسلمان بنایا سراسر لغو ہے۔

عبداللہ بن یٰسین کی وفات ۱۰۵۱ء میں ہوئی۔ لیکن وہ تحریک ان کے بعد بھی زندہ رہی جس کی برکت سے منتشر قومیں اور قبیلے پرچمِ اسلام کے تحت آ کر روحانی مادی اور سیاسی اعتبار سے منظم ہو گئے تھے اور قبیلے جو نیم وحشی تھے، غیر متمدن اور غیر مہذب تھے اسلام نے ان کو ایک مہذب قوم کی شکل دی۔

"ڈان آف ماڈرن جغرافیہ" میں بیزلے لکھتا ہے کہ "الادریسی نے ۱۱۶۰ء میں جب اسی خطہ میں سیاحت کی تو وہاں مسلمانوں کی تعداد کافی تھی۔ لیکن باشندوں پر الحاد غالب تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود بھی بہت سے قبیلوں کے طریقے وہی پرانے تھے۔"

بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک دوسری تحریک "الموحد" سے بھی اسلام کو بے حد تقویت پہنچی۔ تحریک الموحد کے بانی ورُوحِ رواں ابن بطوطہ نے بربری زبان میں اشاعتِ اسلام شروع کی پندرھویں صدی تک اس علاقے کے تمام باشندے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

ابنِ سعود اور فتح ریاض

قسط نمبر ۶

ابن سعود کو الریاض میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ یہ خبر آئی کہ سلطان عبدالحمید کو نوجوان ترک جماعت نے خلافت اور سلطنت سے دست برداری دینے پر مجبور کردیا ہے اور اب اس جماعت کا حکم سلطنت پر نافذ ہوگیا ہے۔ اس خبر کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک نیا خطرہ بھی پیدا ہوگیا ہے۔ اس جماعت نے ترکی اور عرب کے ان صوبوں پر جو برائے نام ترکی حکومت کے مطیع تھے، قبضہ کرنا شروع کردیا ہے، شام و حجاز میں دخل دیا ہے اور عسیر پر قابض ہوچکے ہیں اور اب دوسرے صوبوں کی طرف توجہ کی جارہی ہے، انہوں نے دمشق سے مدینہ تک ریل کی سڑک جلد سے جلد بنانی شروع کردی ہے تاکہ فوج کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک آناً فاناً منتقل کیا جاسکے حسین ابن علی کو شریف مکہ اور حاکم حجاز مقرر کیا ہے۔

چنانچہ حسین شریف مکہ ہوکر آگیا۔ یہ پچاس سال سے کچھ زیادہ عمر میں تھا۔ اور اس کے بشرے سے وقار نمایاں تھا۔ چونکہ باب عالی سے تقرب حاصل رہا تھا اور برسوں سے قسطنطنیہ میں تھا اور وہیں اس کے بیٹوں کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی، سلطنت کی جماعت اعلیٰ کا ایک رکن بھی تھا اور نیز بہت سے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہ چکا تھا، اس لئے اس کا سارا حلیہ ترکی اور عربی میل جول کا نمونہ تھا، اور اس کی ساری افتاد گفتگو اور اخلاق و آداب ایک ترکی درباری پاشا کے تھے۔ اس کی تقریر میں ایک شان نمایاں ہوتی تھی اور وہ اکثر غیر معروف اور بڑے بڑے لفظ زبان پر لانا پسند کرتا تھا۔ وہ پابند صوم و صلوٰۃ ضرور تھا مگر تنگ نظر تھا۔ بہت خود رائے، ہٹ دھرم اور شکی طبیعت کا تھا۔ اس کا انتخاب شریف کے اعلیٰ عہدے پر اس لئے کیا گیا کہ وہ ہاشمی خاندان اور آلِ رسول میں سے تھا جو اس عہدے کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ترک نوجوان جماعت کے رکن اس کو وفادار اور بھروسے کا آدمی خیال کرتے تھے۔

حسین کے شریف مکہ ہونے کے بعد ہی سے ابن سعود اور اس کے درمیان ایک قضیہ اٹھ کھڑا ہوا۔ عتبہ نجد اور حجاز کے مابین ایک مقام ہے۔ یہاں وسیع بلند میدان ہیں جن میں قبائل اپنے اونٹ اور بکری بھیڑیں چرایا کرتے ہیں۔ اسی میدان

میں سے ہو کر نجد اور حجاز کا راستہ بھی گزرتا ہے۔
حسین نے اس پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اور قبائل پر چرائی کا محصول لگا دیا۔ ابن سعود کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور اس نے فوراً چڑھائی کر دی۔ حسین نے مقابلے کے لئے اپنے بیٹے عبداللہ کو بھیجا۔ اور ابن سعود نے اپنے بھائی سعد کو۔ حسین جنوب کی طرف یمن میں تھا۔ سعد کو عبداللہ نے شکست دی اور اس کو قید میں ڈال دیا۔ ابن سعود نے چاہا کہ خود فوج کشی کرے لیکن تازہ خطرہ یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ اس کے چچیرے بھائیوں نے عجمان کے قبائل سے سازش کر کے حملہ کرا دیا۔ ان کے ساتھ اور قبیلے بھی شریک ہو گئے جن میں لیلیٰ گاؤں کا قبیلہ بھی تھا۔ ریاض بھی خطرہ میں آ گیا۔

ابن سعود نے حسین سے صلح کر لی۔ اور سعد کو تاوان ادا کر کے قید سے رہا کرا لیا۔ اب اس نے حملہ آور قبائل کے مقابلہ میں اپنا لشکر بھیجا اور ان کو شکست دے کر ان کی اچھی طرح سرکوبی کی چچیرے بھائی تو ادھر ادھر بھاگ گئے لیکن دوسرے سرکشوں کو پکڑ کر ان کے سر بڑی بے رحمی سے ایک دربار کر کے کاٹے، دربار میں بہت سے قبیلے شریک تھے۔ اس کی خبر ہر طرف ملک میں پھیل گئی جس سے ایسی دھاک بندھی کہ اس کے بعد تھوڑے دن تک کسی نے سر نہ اٹھایا۔

اس طرح دشمنوں کو چاروں طرف شکست دے کر اب اس کو دم لینے کا تھوڑا سا وقت مل گیا۔ رشید کا سر یہ پہلے ہی کاٹ چکا تھا اور اس کی اولاد آپس میں ہی جھگڑ رہی تھی۔ ان کی طرف سے حملہ کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا، شمار کے قبائل خود مختار تھے، ان کا کوئی امیر نہیں بنا جس سے یہ خطرہ پیدا ہوتا کہ وہ ان کو بھی جمع کر کے حملہ کرے گا۔ اندرونی سازشوں کے سرکشوں کو اس نے سخت سزائیں دے کر بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔

جب اس طرح اطمینان حاصل ہو گیا تو اس نے ممالک محروسہ کا دورہ کیا اور ان کے نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوا۔ چاروں طرف کی راہیں جن پر قبائل اپنی اپنی حدود میں قافلوں پر محصول لگاتے تھے، کھول دیں جس سے قافلے بلا روک ٹوک اور بلا خوف لوٹ مار آنے جانے لگے۔

۱۹۱۲ء میں اس نے جنوبی صوبوں کا دورہ کیا اور ادھر کے انتظامات بھی اسی طرح کرنے شروع کئے۔ وہیں اس کو یہ اطلاعیں ملیں کہ وادش پھر واپس آ گیا ہے، مطیر اور عجمان کے قبیلے پھر سرکشی پر آمادہ ہو گئے ہیں، حسین بھی اس صلح پر قانع نہیں ہے جو باہم ہو چکی تھی۔ مبارک فساد پیدا کر رہا ہے، ترک بنی شمار کو مدد دے کر اس کے خلاف ایک لشکر تیار کرا رہے ہیں۔ اور انہوں نے بغداد میں بہت فوج جمع کی ہے۔ ترکوں نے حسین سے یہ وعدہ کیا ہے کہ اس کو تمام عربی قبائل پر امیر بنائیں گے اور سب سے زیادہ یہ کہ حفوف میں بہت سی فوج بھیج دی ہے۔ اور حاکم کو اس پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

یہ خبریں بڑی وحشتناک تھیں مگر ان کے ساتھ یہ خبر بھی آ گئی کہ ترک اپنی تمام فوجیں واپس بلا رہے ہیں کیونکہ طرابلس کی جنگ میں جو اٹلی سے ہو رہی تھی ان کو شکست ہو گئی ہے اور بلغاریہ نے ان کے خلاف

اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ اور اس کی فوجیں قسطنطنیہ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ جس سے دار الخلافہ خطرہ میں آ گیا ہے۔

ابنِ سعود نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی کہ ہفوف پر جو الاحسار کا دار الحکومت ہے حملہ کر دے، چنانچہ اس نے سات سو نبرد آزما جانباز اپنے ساتھ لئے اور دن رات منزلیں طے کرتا ہوا ہفوف میں اس طرح آ پہنچا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی، شہر کے باہر کھجور کے جنگل میں وہ اپنے سب آدمیوں کے ساتھ مقیم ہوا جب رات کی تاریکی زیادہ ہو گئی تو وہ اور چند جانباز شہر پناہ کے نیچے خندق میں جا چھپے، شہر پناہ پر پہرہ تھا لیکن جیسے ہی ایک پہرہ دار اپنی گشت میں ادھر سے گزر کر آگے چلا گیا یہ سب دیوار پر چڑھ گئے۔ اور اپنے چھرے نکال کر دروازہ کے محافظوں پر آ پڑے اور ان کا قلع قمع کر کے دروازہ کھول دیا۔ اور اپنے لشکر کو شہر میں داخل کر لیا۔ اس کے بعد یہ قلعہ پر چڑھ دوڑے۔ اور ترکوں کو اچانک جا لیا۔ ان کو منتشر کر دیا اور بہت سوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔

صبح کو جب شہر جاگا تو وہ شہر کے بڑے دروازہ سے نکلا اور اس نے اپنے علم کے لہراتے ہوئے پرچم کے نیچے پوری شان و شوکت کے ساتھ شہر کا گشت کیا تمام شہر اس کا مطیع ہو گیا۔ حاکم اور اس کی بچی کھچی فوج نے مسجد ابراہیم میں پناہ لی اور اس سے امان طلب کی۔ اس نے ترکی فوج اور گورنر حاکم کو پورے جنگی اعزاز کے ساتھ شہر سے رخصت کیا۔

اس فتح کے بعد ابن سعود تمام صوبہ الاحسار پر جلد قابض ہو گیا۔ اس نے جلوی کو اپنا نائب مقرر کیا۔

ترکوں نے یہ سوچ کر کہ انہیں خود پایہ تخت قسطنطنیہ کی حفاظت کرنی ہے اس حالت کو قبول کیا۔ اور اس کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے الاحسار نجد کا ایک صوبہ قرار دے دیا گیا اور ابن سعود دونوں کا امیر مانا گیا۔ ترکوں نے اس کو والی کا لقب دیا اور اپنی طرف سے اس کو زر اور اسلحہ دیئے۔ انہوں نے آئندہ اس کے صوبوں کے اندرونی نظم و نسق میں مداخلت نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اور ابن سعود نے ان فوائد کے معاوضے میں ترکی سلطنت کی سرپرستی میں آنا منظور کیا۔

الاحسار کی فتح اور ترکوں سے مفید معاہدہ کی خبر جب عرب قبائل میں پہنچی تو سب نے بخوشی اس کی اطاعت قبول کر لی، اب پھر وہ اپنے نظم و نسق ملک کی طرف متوجہ ہوا، اس نے یہ ارادہ کیا کہ عرب کے پراگندہ ملک کو اور اس کے بکھرے ہوئے اجزاء کو ایک نظام میں باندھ لے۔ نجد اور الاحسار کے صوبوں کی آبادی بائیس لاکھ پچاس ہزار نفوس کی ہے جس میں بیس لاکھ آدمی نجد میں آباد ہیں جو سارے عرب میں سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اور ڈھائی لاکھ الاحسار میں، ان صوبوں میں تمدن اور معاشرت کا بڑا فرق ہے۔ الاحسار کی ساری آبادی زراعت اور تجارت پر زندگی بسر کرتی ہے۔ اور شہر و قریے بنا کر ہیں میں محبت اور یگانگت کا برتاؤ کرتی ہے، ان کے شیوخ اور امیر عدل اور انصاف کرتے ہیں، یہ ان کے فیصلے مانتے ہیں اور ان کو محصولات ادا کرتے ہیں۔ ان میں شیعہ سنی برابر برابر ہیں مگر مذہبی اختلافات کے جھگڑے مفقود ہیں۔ ان میں بدو قبیلے جو نجد کے قبائل کی طرح

راہ زنی کرتے ہیں اور صحرائی عزلوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں، تقریباً معدوم ہیں۔ برخلاف اس کے نجد کی آبادی کا نصف حصہ بدوی قبائل پر مشتمل ہے۔ ان کے قبیلے ایسے بھی ہیں جو قدیم سے متمدن زندگی بسر کرتے ہیں۔ مثلاً

قبیلۂ عنزہ و حرب جو نجد کے شمال و مشرقی علاقہ میں آباد ہے۔

قبیلۂ عتیبہ و مطیر جو شمال و غربی علاقہ میں آباد ہے۔

قبیلۂ شمر جو شمالی علاقہ میں آباد ہے۔

قبیلۂ قحطان جو جنوب و غربی علاقہ میں آباد ہے۔

قبیلۂ سبع و السہول جو غربی علاقہ میں آباد ہے۔

قبائل مرہ بنو خالد اور العجمان جو شرقی علاقہ میں آباد ہیں

ان قبائل کے وہ گروہ جو ٹھیٹ صحرائی زندگی بسر کرتے تھے، اونٹ، گھوڑے اور بکریاں پالتے اور چراتے پھرتے تھے۔ وہ کسی قریے اور گاؤں یا شہر میں سکونت اختیار نہیں کرتے تھے بلکہ جس طرف کو منہ اٹھا ادھر جا کر اپنے خیمے لگا دیتے تھے اور پھر کچھ دن کے بعد کہیں اور جا کر مقام کرتے تھے۔ ان کا بڑا مشغلہ قزاقی اور راہزنی تھا۔ یہ دین و مذہب سے بالکل ناآشنا تھے۔

یہ تو وحشی تھے ہی لیکن متمدن لوگ جن کو بدو کے مقابل حضر کہتے ہیں وہ بھی زیور تہذیب سے کچھ زیادہ آراستہ نہ تھے۔ یہ ہر قسم کے مطالبات لئے ہوئے ابن سعود کے پاس آتے تھے اور ان کے دلوں پر یہ بات جمی ہوئی تھی کہ اگر انہوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو اس کی ساری حکمرانی ختم ہو جائے گی، ان کو یہ گھمنڈ تھا کہ انھیں نے ساری فتوحات کی ہیں۔

ابن سعود کو یہ مشکلات اس وقت درپیش ہوئیں جب اس نے ان صوبوں میں نظم و نسق قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ بدؤں کو دین و مذہب سے آشنا کیا جائے۔ اور ان کے سامنے شہری زندگی کا نمونہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ چند مقامات پر جہاں اچھے پانی کے کنوئیں موجود تھے، وہاں بدو کی کچھ بستیاں بسائیں ہر بستی میں ایک مسجد تعمیر کی اور ایک عالم کا تقرر کر کے اس کے سپرد اُن کی زندگی کا ہر شعبہ کر دیا۔ انھیں زراعت کرنے کا طریقہ سکھایا اور ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے مسجد سے ملحق ایک مدرسہ قائم کیا۔

زندگی کا یہ نمونہ دیکھ کر بدو جوق در جوق آنے لگے اور جگہ جگہ بستیاں بنا کر آباد ہونے لگے۔ ابن سعود نے ان کو اخوان کا لقب دیا اور اپنی فوج میں بھرتی کے لئے ان کو بہت سی مراعات دیں۔ ان بستیوں کی آبادی روز بروز بڑھنے لگی اور تھوڑے سے عرصہ میں ان آبادی ہزاروں تک پہنچ گئی۔ اس طرح ۲۰۰ گاؤں اور شہر جن کی مجموعی آبادی ۶۵ ہزار ہے، نجد کے صحرا میں ابن سعود کے جود و کرم سے وجود میں آ گئے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب دولت دنیاوی کی حرص، قومیت کا گھمنڈ اور فوجی طاقت کا زور انگریز اور جرمنوں کو مد مقابل لا رہے تھے اور دونوں اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے سیاسی چالیں چل رہے تھے۔ ان کے قاصد عرب میں شریف حسین، یحییٰ امام یمن، ابن رشید، امیر حائل شیخ العجمان، مبارک امیر کویت اور ابن سعود امیر نجد والاحسا کے پاس آئے اور جانبین سے ان کے نام اپنی حکومتوں کے نامے و پیام لائے اور خفیہ یا ظاہرا باہمی معاہدے کرنے کی رغبت دی، ان کے ساتھ اشرفیوں کے توڑے تھے جن کو وہ اپنے ساتھ پیٹیوں میں لاتے تھے۔ (باقی بر صفحہ ۲۴ پر)

نقد و نظر

خطبات حکیم الامت — تسہیل دعوات عبدیت

مؤلفہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رح تھانوی: — ناشر ادارہ اشرف العلوم دیوبند۔ صفحات ۱۹۲، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت دو روپیہ۔

یہ حضرت تھانوی رح کے مواعظ کے سلسلہ کی مشہور تالیف ہے۔ متعدد بار چھپ چکی ہے۔ ادارہ اشرف العلوم نے ان مواعظ کی نایابی کی بنا پر انھیں تسہیل مواعظ کے عنوان تحت بالاقساط شائع کرنا شروع کیا ہے۔ یہ دعوات عبدیت کے سلسلے کا دوسرا حصہ ہے۔ جس میں پانچ وعظ ہیں۔

حقوق المعاشرت، الاخلاص حصہ اول۔ الاخلاص حصہ دوم۔ الاصلاح النساء، ذم الہوی۔ باقی ملفوظات ۲۸ مقالات حکمت اور ۱۳ مجادلات معدلت پر مشتمل ہیں۔

حضرت تھانوی رح کے مواعظ کی تاثیر گزشتہ نصف صدی میں ضرب المثل بن چکی ہے۔ اثر انگیزی اور اصلاح احوال میں آج بھی ان مواعظ کو وہی درجہ حاصل ہے جو واعظ جنت مقام کی حیات میں تھا۔ ادارہ اشرف العلوم نے ان مواعظ کی اشاعت شروع کر کے ایک بہت بڑی دینی ضرورت پوری کی ہے۔ ادارہ نے اسی سلسلے کے اگلے حصے بھی شائع کئے ہیں جو ادارہ کے ممبران کو رعایتی قیمت پر فراہم کئے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ اشاعت دوماہی پروگرام کے تحت چل رہا ہے ہمارے نزدیک اوقات فرصت میں کچھ نہ کچھ وقت ان مواعظ کے مطالعہ کے لئے ہر اس شخص کو نکالنا چاہیئے جو اصلاح نفس کا طالب ہو، خواہ وہ کسی سلسلۂ ارشاد سے وابستہ ہو یا نہ ہو۔

ہدایت القرآن

مؤلف مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی۔ ناشر مکتبہ شہاب دیوبند صفحات ۱۸۸، سائز ۲۲×۳۶ قیمت:

آسان اور عام فہم تفسیر کا ایک نیا اور مفید سلسلہ جو اب تک کی آسان تفاسیر کے مقابلہ میں ایک نیا طرز لئے ہوئے ہے۔ یہ پارۂ عم کے نصف اول کی تفسیر ہے، مصنف کا طرز یہ ہے کہ ابتدا میں مکمل ایک سورۃ ہے۔ اس کے بعد کالم وار الفاظ کا ترجمہ ہے۔ پھر اس سورۃ کا خلاصہ اور عمود بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد اس کی تشریح ہے۔ آخر میں پھر اس سورۃ کے مضمون کو سمیٹ کر چند سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ذہن نشین کرنے کے لئے یہ طرز توقع ہے کہ مفید ثابت ہوگا کاشف صاحب جانے پہچانے مؤلف ہیں ان کی یہ کوشش خدا کرے بخیر و خوبی تکمیل پذیر ہو

م لوگوں کی سہولت کے لئے یہ سلسلۂ تفسیر قسط وار
ائع کیا جا رہا ہے. ممبران کے لئے خصوصی رعایت
ہے جس کی تفصیلات ادارہ سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

ساسِ عربی | مؤلفہ محمد نعیم الرحمٰن ایم۔ اے، ناشر نور محمد روڈ، آرام باغ. کراچی۔

ائز ۲۰×۲۶. صفحات ۲۳۰. قیمت پانچ روپے۔

عربی صرف و نحو کے قواعد جدید طرز پر مرتب کئے
ئے ہیں. یوں اس لحاظ سے یہ کوشش اتنی جدید بھی
یں ہوئی کہ یہ سنہ ۱۹۳۱ء کی تالیف ہے۔ اس سے قبل
ا ہندوستان سے شائع ہو چکی ہے. موجودہ ناشر
ہ اسے فوٹو آفسٹ میں نہایت روشن کتابت کے ساتھ
ائع کیا ہے. اس کتاب کی ترتیب میں انگریزی نحوی تجر
ے بہت کچھ استفادہ کیا گیا ہے. اگرچہ مؤلف کے
ب نظر صرف و نحو کے دوسرے مجموعے بھی رہے ہیں۔

ابتدا میں عرب کے جغرافیہ اور اس کی لسانی
ریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد حروف ہجا
ے کتاب کا آغاز کیا گیا ہے. آخر میں عربی صرف و نحو
ہ انگریزی مترادفات ایک ضمیمہ کی شکل میں شامل

کر دیئے گئے ہیں. عوامل النحو کی مشہور نظم بھی آخر میں درج ہے۔ اگرچہ گزشتہ تیس برس میں جدید عربی زبان کے قواعد کی ترتیب میں اچھی خاصی پیش رفت ہوئی ہے مگر اپنے مواد اور ترتیب کے لحاظ سے پیش نظر کتاب آج بھی ایک بھاری بھرکم حیثیت رکھتی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات اس کتاب سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بعض مقامات اصلاح طلب ہیں مثلاً حرف ب کے استعمال میں صفحہ ۲۵۸ پر ب کا استعمال بتانے کے بجائے س کا استعمال بتلایا گیا ہے۔ هَلْ زَيْدٌ بِجَائِعٍ میں ب استفہام کے معنیٰ میں محل نظر ہے، ہمزۂ استفہام کے استعمال کی، امثالیں جو بیان کی گئی ہیں وہ بھی نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں بنیادی قواعد اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں، مگر قواعد کے بیان میں تشریحی انداز کم ہے، اصطلاحی پہلو غالب ہے. تاہم بحیثیت مجموعی مواد کے اعتبار سے یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے جدید درسیات کے سلسلے میں ایک مددگار کتاب کی حیثیت سے ضرور شامل کیا جانا چاہئے۔

دیانت

ایک بار حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے سو اشرفیوں کا توڑا پایا۔ اور کمال دیانت کے ساتھ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا. آپ نے فرمایا کہ ایک سال تک مالک کی جستجو میں منادی کرتے رہو۔ انہوں نے تعمیل ارشاد کی. دوسرے سال پھر حاضر ہوئے تو آپ نے پھر یہی حکم دیا۔ وہ حکم بجا لائے۔ پھر تیسرے سال آئے آپ نے پھر یہی ارشاد فرمایا. جب اب بھی مالک نہ ملا تو آپ نے فرمایا کہ حفاظت رکھ لو، مالک مل گیا تو خیر ورنہ خود خرچ کر ڈالو۔

الدَّرسُ العربیُّ

فعل نہی

PROHIBITIVE –

(۱) لَا تَبْخَلْ تو بخل نہ کر

(۲) لَا تَجْلِسْ ھُنَا۔ تو یہاں نہ بیٹھ

(۳) لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔ تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ

(۴) لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا۔ تو زمین پر اکڑ کر نہ چل

(۵) لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ تم غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے

(۶) لَا تَقْنَطْ مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو

(۷) لَا تُطِعِ الْکَافِرِیْنَ وَالْمُنَافِقِیْنَ۔ تو کفار اور منافقین کا کہا نہ مان

(۸) لَا تَخْرُجِیْ مِنَ الْبَیْتِ تو گھر سے نہ نکل (ایک عورت)

(۶) لَا تَجْلِسِیْ ھُنَا (تو ایک عورت) یہاں نہ بیٹھ

(۷) لَا تَتَّخِذِیْ ھُزُوًا۔ تو مذاق نہ بنا

(۸) لَا تَتَزَیَّنَّ زِیَّ الرِّجَالِ۔ تم (عورتیں) مردوں کی ہیئت نہ بناؤ

(۹) لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ ایک جماعت دوسری جماعت کا مذاق نہ اڑائے

(۱۰) لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَہُنَّ۔ وہ عورتیں اپنا سنگار (لوگوں کو) نہ دکھائیں

(۱۱) لَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ۔ نہ وہ (عورتیں) چوری کریں نہ زنا

فعل نہی وہ فعل ہے جس کے ذریعہ کسی کام کو کرنے سے روکا جائے

قاعدہ:- نہی فعل مضارع سے بنتی ہے — قاعدہ یہ ہے کہ مضارع کے شروع میں لام لگا کر آخری حرف ساکن کر دیا جائے، جیسے تَجْلِسُ سے لَا تَجْلِسْ۔ یہ آخری حرف ساکن صرف پانچ صیغوں میں ہوتا ہے — واحد مذکر غائب، واحد مؤنث غائب، واحد مذکر حاضر۔ واحد و جمع متکلم سات صیغوں سے نون (اعرابی) گر جاتا ہے، چار تثنیہ۔ جمع مذکر غائب و حاضر، واحد مؤنث حاضر۔ دو صیغوں جمع مؤنث غائب و حاضر میں نون بدستور باقی رہتا ہے۔ (یہ نون نون ضمیر کہلاتا ہے)

گردان

لَا تَجْلِسْ تو نہ بیٹھ	لَا تَجْلِسَا تم دو نہ بیٹھو	لَا تَجْلِسُوْا۔ تم سب نہ بیٹھو۔	لَا تَجْلِسِیْ تو ایک عورت نہ بیٹھ
واحد مخاطب	تثنیہ مخاطب	جمع مخاطب	واحد مؤنث مخاطب

لَا تَجْلِسَا تم دو (عورتیں) نہ بیٹھو۔	لَا تَجْلِسْنَ۔ تم سب عورتیں نہ بیٹھو
تثنیہ مخاطب مؤنث	جمع مؤنث مخاطب

—٥—

الدرس العربی

—(مختارات صحفیۃ)—

تُعْتَبَرُ اندونیسیا ثَانِیَۃَ بِلَادِ العَالَمِ فی الْمَوَارِدِ الطبیعیّۃ۔

عَاصِمَتُہا جاکرتا ومَسَاحَتُہَا ۷۳۵,۸۶۵ مِیلاً مُرَبَّعاً وعدد سُکَّانِہا ۸۹,۶۰۰,۰۰۰

یَشْتَغِلُ ۸۰٪ مِنَ السُّکَّانِ بِالزِّرَاعَۃِ۔

ومِنْ اھمّ المَحْصُولَاتِ الزِّرَاعِیَّۃِ الارزّ، والذرۃ وَالبَطَاطا وجَوْزُ الھند والبُنّ، والشَّای والفُلْفُلُ والقُطْنُ وَالمَطَّاطُ

ومن اھم مَعَادِنِہا زَیتُ البترول وَالفَحْمُ والنُّحاسُ والنِّیکل وَالذَّھَبُ والفضّۃ

وقد بَلَغَ اِنْتَاجُہا من زَیْتِ البِتْرُول الخام فی عَامِ ۱۹۵۹ حَوالی ۱۸ملْیُون طنّ۔

وقد ظَلَّتْ اندونیشیا تُعانی الِاسْتِعْمَارَ الھولندی ثلاثۃ قُرُونٍ ونِصْفٍ۔

ثمّ احتلّتہا الجُیُوشُ الیَابَانیّۃ اثنَاءَ الحربِ العَالَمِیَّۃِ الثانیّۃ۔

ثمّ حَصَلَتْ عَلَی الِاسْتِقْلَالِ عَامَ ۱۹۴۵ بَعْدَ کِفَاحٍ مریرٍ بقیادَۃِ الدکتور احمد سوکارنو

انڈونیشیا قدرتی پیداوار کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے

اس کا پایۂ تخت جاکرتا۔ اس کا رقبہ سات لاکھ ۳۵ ہزار ۸ سو ۶۵ میل مربع۔ اور اسکی آبادی ۸ کروڑ ۹۶ لاکھ ہے۔

اسی فیصد باشندے زراعت کا کام کرتے ہیں

اہم زرعی پیداوار میں چاول، مکی، آلو، ناریل کافی، چاء، مرچ، روئی اور ربر ہے۔

اسکی اہم معدنیات میں پٹرول، کوئلہ، تانبا نیکل، سونا اور چاندی ہے۔

۱۹۵۹ء میں اسکے خام پٹرول کی پیداوار ایک کروڑ اسی لاکھ ٹن تک پہنچ گئی۔

انڈونیشیا ہالینڈ کی سامراجیت کا ساڑھے تین سو سال شکار رہا۔

پھر اس پر دوسری عالمگیر جنگ کے دوران جاپانی فوجوں نے قبضہ کرلیا۔

اسکے بعد ۱۹۴۵ء میں زبردست قومی جہاد کے بعد ڈاکٹر احمد سوکارنو کی قیادت میں خودمختاری حاصل کی۔

— ۵ —

المَوَارِد۔ آمدنی۔ ذرائع آمدنی۔

عاصمۃ۔ دارالحکومت۔

مساحۃ۔ رقبہ

محصولات، پیداوار۔ آمدنی

معادن و: مَعْدِن۔ دہات۔ زمین سے نکلنے والی اشیاء

احتلال: قبضہ کرنا

استقلال۔ خودمختاری

کِفاح۔ جدوجہد۔ کدوکاوش

رئیس الاحرار

(از عزیز الرحمٰن صاحب جامعی) اس کتاب نے پچاس سال کی سیاسی تاریخ کے نقشے میں ایسے نقش و نگار کا اضافہ کیا ہے کہ جو کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔ جنگِ آزادی کی سیاسی تاریخ میں بدقسمتی سے گہرے پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔ کتاب "رئیس الاحرار" کے مطالعہ سے متعدد واقعات بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اس کتاب کے ذریعہ وہ تمام مواد منظرِ عام پر آگیا ہے جس کی توقع کسی اور ذریعہ سے نہ ہو سکتی تھی اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ ان واقعات کے ذکر کے بغیر جنگِ آزادی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی تھی تو اس میں قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کتاب میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے خاندانی اور شخصی حالات اور مولانا مرحوم کی دوسرے لیڈرانِ وطن اور علمائے وقت سے خط و کتابت مکمل طور پر آگئے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعہ تحریکِ آزادی ہند اور قیامِ پاکستان کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ قیمت مجلد پانچ روپئے۔

شاہنامۂ اسلام

(از شاعرِ اسلام حفیظ جالندھری)

شاہنامۂ اسلام تاریخِ اسلام کی منظوم کتاب ہے جس میں ایسے واقعات درج ہیں کہ جن کو پڑھ کر آپ کی رگِ حمیت پھڑک اٹھے گی اور اسلام کی حقیقی روح تازہ ہو جائے گی۔

قیمت رف گلیز ڈ فی جلد دو روپے، مکمل چار جلدیں آٹھ روپے

گلیز ڈ سفید فی جلد تین روپیہ۔ مکمل چار جلدیں بارہ روپے۔

مکتوباتِ شیخ الاسلام

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے تقریباً دو سو خطوط پر مشتمل علمی، تحقیقی، سیاسی افکار کا عظیم الشان ذخیرہ۔ جلد اول ۶/۵۰ جلد دوم چھ روپیہ۔ جلد سوم چار روپئے۔ ۵۰ نئے پیسے۔

قرآن پاک مترجم و محشّٰی

شیخ المشائخ حضرت مولانا محمود الحسنؒ (شیخ الہند) - شیخ التفسیر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی (دیوبند)۔ اس قرآن پاک میں ترجمہ تو شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اسیر مالٹا کا مکمل ہے۔ ان کی تفسیر صرف چار جلدوں میں ہے باقی ۲۶ پاروں کی تفسیر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے قلم سے ہے۔ اس ترجمہ و تفسیر کی حقیقت مروجہ تراجم اور تفاسیر کے مقابلہ میں ستاروں میں درخشاں چاند جیسی ہے۔ سرورق ہفت رنگ، آرٹ قابل دید ہے ہر پارہ کی پہلی سطر جلی اور ہر پارہ ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے، کاغذ عمدہ۔ ہدیہ بلا جلد اکیس روپے۔ مجلد پارچہ عمدہ چوبیس روپے۔ چرمی پچیس ۲۵ روپے۔

معارف المشکوٰۃ

از مولانا سید عبد الرؤف صاحب عالی۔ حدیث کی مقبول عام کتاب مشکوٰۃ شریف کی تدوین اردو شرح مظاہر حق نئے انداز میں ۱۔ متن مشکوٰۃ با اعراب ۲۔ سلیس اردو ترجمہ سیر حاصل اور عام فہم تشریح ۳۔ عہدِ سلف کا مواد ۴۔ عصرِ حاضر کی زبان ۵۔ ایمان پر اعتقادی مسائل، راویانِ مشکوٰۃ کے حالات ۶۔ روایاتِ مشکوٰۃ کی تخریج، ایک بسیط و نفیس مقدمۂ حدیث، ایک عظیم القدر شرح، صحاح ستہ کا نچوڑ اور دیگر کتبِ حدیث کا حاصل ۲۰×۳۰ کے تقریباً سو صفحات پر ہر ماہ ایک ایک جزو کی شکل میں اشاعت منزل دیوبند سے شائع ہو رہی ہے۔ قیمت فی جزو دو روپے علاوہ محصول۔ ایجنٹ و بیلے ہٹس بری فیصلہ پوری کتاب کے خریدار بننے والوں کو ہر جزو سوا روپیہ میں علاوہ محصول

ملنے کا پتہ:- مکتبۃ القاسم، دار الفکر، دیوبند - یو۔پی

egd. No. A- 1596
Alqasim Monthly Deoband, (U. P.)

No. A- 1596

Alqasim Monthly Deoband, (U. P.)

القاموس الجدید

اردو عربی ڈکشنری

Price Rs. 7/-

المطالعۃ المحمودۃ

Price Rs. 1/4/-

روحانی دنیا

Price Re. 1/-

مکتبہ دارالفکر دیوبند

Maktaba Darulfikr, Deoband. U. P.